کلیاتِ مجید امجد

طبعِ نو

روزِ رفتہ

ترتیب، تدوین و تحقیق

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

روزِ رفتہ

مجید امجدؔ

روزِ رفتہ

1	موجِ تبسم	۱۹۳۲
2	اقبال	۱۹۳۳
3	ہوائی جہاز کو دیکھ کر	۱-۱۲-۱۹۳۴
4	آہ یہ خوشگوار نظارے	۱۹۳۴
5	محبوبِ خدا سے	۱۹۳۴
6	رازِ گراں بہا	۲۴-۱۲-۱۹۳۴
7	گاؤں	۲۴-۷-۱۹۳۵
8	حالیؔ	۱-۱۱-۱۹۳۵
9	لہر انقلاب کی	۱۰-۱۹۳۶
10	محرومِ ازل	۱۶-۱۰-۱۹۳۶
11	عشق کی ٹیسیں جو مضراب رگِ جاں ہو گئیں (غزل)	۲۴-۲-۱۹۳۷
12	نذرِ محبت (سانیٹ)	۱۶-۴-۱۹۳۷
13	پس پردہ	۸-۶-۱۹۳۷
14	نو وارد	۴-۹-۱۹۳۷
15	جنگ	۸-۱۰-۱۹۳۷
16	تیرے بغیر	۲۷-۱۰-۱۹۳۷
17	یہی دنیا	۱۴-۱۲-۱۹۳۷
18	شرط	۲۶-۱۲-۱۹۳۷
19	اقبالؔ	۸-۱-۱۹۳۸
20	مطربہ سے	۲۴-۱-۱۹۳۸

مجید امجد (سوانحی خاکہ)

مجید امجد ۲۹ جون ۱۹۱۴ء کو جھنگ صدر (مگھیانہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک غریب اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ابھی وہ دو برس کے تھے جب ان کی والدہ اپنے شوہر سے الگ ہو کر میکے آ گئیں۔ امجد نے ابتدائی تعلیم اپنے نانا سے حاصل کی جن کا شمار جھنگ کے صوفیا میں ہوتا تھا۔ گھر سے ملحقہ مسجد میں انہوں نے چند سال قرآن' اسلامیات' فارسی' عربی اور طب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔

۱۹۳۰ء میں میٹرک اور ۱۹۳۲ء میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان اچھے نمبروں سے پاس کئے اور ۱۹۳۴ء میں اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) لاہور سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔

اُس زمانے میں دنیا عظیم اقتصادی بحران کا شکار تھی اس لئے ملازمتیں عنقا تھیں۔ مجید امجد جھنگ میں ایک مقامی ہفت روزہ اخبار ''عروج'' سے بطور مدیر وابستہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ کلرک کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ۱۹۴۴ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران حکومت نے سول سپلائز ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔ مجید امجد ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد منتخب ہوئے اور اسسٹنٹ انسپکٹر سول سپلائز کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بعدازاں یہ محکمہ فوڈ ڈیپارٹمنٹ کا حصہ بن گیا۔ مجید امجد آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ انہوں نے بے شمار چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں کام کیا لیکن ملازمت کا زیادہ عرصہ منٹگمری (موجودہ ساہیوال) میں بسر ہوا۔ جہاں سے وہ ۲۸ جون ۱۹۷۲ء کو اٹھائیس سال ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

مجید امجد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ بیوی سے ان کے تعلقات عمر بھر ''خنک'' رہے۔ بیوی جھنگ کے ایک سکول میں پڑھاتی تھی امجد دوسرے مقامات پر ملازمت کرتے تھے اور شاذ و نادر ہی جھنگ جاتے تھے۔

امجد بڑے وسیع المطالعہ تھے بالخصوص فارسی اور انگریزی شاعری پر انہیں عبور حاصل تھا۔ سائنسی علوم کے مطالعے سے بھی شغف تھا۔ بہت کم گو شرمیلے اور تنہائی پسند تھے۔ اپنی ذات اور شاعری کے بارے میں قطعاً گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حقیقی معنوں میں ان کا کوئی دوست نہیں تھا۔ وہ ملنے جلنے والوں سے ''ذاتی معاملات'' پر کبھی گفتگو نہیں کرتے تھے۔ انتہائی دیانت دار اور خوددار تھے۔

جوانی میں امجد خوش شکل تھے لیکن رفتہ رفتہ بیمار رہنے لگے اور بہت دبلے پتلے ہو گئے تھے۔ لمبا قد تھا اس لئے دبلاپے نے حسنِ صورت میں کمی کر دی تھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن بہت دیر سے ملی اس لئے نوبت فاقہ کشی تک جا پہنچی تھی۔ اسی عالم میں ۱۱ مئی ۷۴ء ۱۹ء کے اپنے کوارٹر واقع فرید ٹاؤن ساہیوال میں مردہ پائے گئے۔ تدفین اگلے روز جھنگ میں ہوئی۔ ان کی لوحِ مزار پر انہی کا یہ شعر کندہ ہے۔

کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجد
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول

شب رفتہ

مجید امجد کی زندگی میں ان کا ایک ہی مجموعہ ''شب رفتہ'' کے نام سے ۱۹۵۸ء میں نیا ادارہ لاہور کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے کو ترتیب دیتے ہوئے امجد نے اپنا ابتدائی کلام یکسر خارج کر دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۴ء کے درمیان ان کی اکا دکا نظمیں شائع ہونے لگی تھیں لیکن یہ شاعری انہوں نے شب رفتہ میں شامل نہیں کی۔ میرے نزدیک ان کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا۔ ان کی نظم ''حسن'' ۱۹۳۵ء میں جوش ملیح آبادی کے رسالے ''کلیم'' میں شائع ہوئی تھی۔ شب رفتہ کا آغاز انہوں نے اس نظم سے کرنا مناسب خیال کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۸ء تک ان کا بہت سا کلام ادبی رسائل و جرائد میں باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ لیکن اسی سال جب شب رفتہ ترتیب دی گئی تو اس میں سے ایک کڑا انتخاب اس میں شامل کیا گیا۔ شب رفتہ میں شمولیت سے محروم رہ جانے والی بعض نظمیں بہت عمدہ ہیں مگر چونکہ ''شب رفتہ'' مجید امجد کی زندگی میں شائع ہونے والا ان کا واحد مجموعہ ہے اس لئے اس کی الگ شناخت برقرار رکھی گئی ہے۔ امجد نے شب رفتہ کو سنین تخلیق کے مطابق مرتب نہیں کیا تھا لیکن میں نے اس مجموعے کی تمام نظموں کو بختی سے سنین کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ زیر نظر کلیات کے اس حصے میں وہ تمام نظمیں شامل ہیں جو ۱۹۵۸ء میں طبع ہونے والی ''شب رفتہ'' میں موجود تھیں لیکن اب ''تاریخ وار'' ترتیب پانے کی وجہ سے کسی قدر آگے پیچھے ہو گئی ہیں۔

روزِ رفتہ

مجید امجد نے جو کلام ''شب رفتہ'' میں کسی بھی وجہ سے شریک نہیں کیا تھا اُسے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان میں وہ شاعری بھی ہے جو انہوں نے زمانہ طالب علمی میں کی تھی۔ اور وہ کلام بھی ہے جو شب رفتہ میں شمولیت کا مستحق تو تھا مگر کئی وجوہ کی بنا پر شامل نہیں کیا گیا تھا۔ بعض جگہ یہ فیصلہ کرنا سہل نہیں کہ دونوں میں حد فاصل کس طرح قائم کی جائے اس لئے انہیں یکجا رکھا گیا ہے۔ گویا اس حصے میں ان کی ابتدائی اور زمانہ طالب علمی کی شاعری بھی شامل ہے اور شب رفتہ کے دور کی عمدہ شاعری بھی موجود ہے مگر چونکہ یہ

سارا کلام ان کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس لئے کلیات میں اس کی شمولیت کا کافی جواز موجود ہے۔ اس حصے کو ''باقیات'' کا عنوان دے کر کلیات کے آخر میں اس لئے جگہ نہیں دی گئی کہ مجید امجد ان میں سے کئی نظمیں اپنے مجموعہ کلام میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بعض نہایت اہم نظموں کو بالکل آخر میں لگا دیا جاتا تو ان تک رسائی مشکل ہو جاتی اور ان کے نظر انداز ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا (موجودہ اشاعت میں اس حصے میں بعض نظموں کا اضافہ بھی کیا گیا ہے)

امروز

شب رفتہ کے بعد اگر چہ مجید امجد کا کوئی مجموعہ ان کی زندگی میں نہیں چھپا لیکن انہوں نے ایک ملاقات میں (جو ۱۹۷۲ء میں ہوئی) مجھے یہ بتایا تھا کہ شب رفتہ کے بعد انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے دو مختلف مزاج ہیں اس لئے اس کے دو الگ الگ مجموعے شائع ہونے چاہئیں۔ ایک مجموعہ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہو اور دوسرے میں ۱۹۶۸ء اور اس کے بعد کی تخلیقات شامل ہوں لیکن ''مجید امجد اشاعتی کمیٹی -- لاہور'' نے ''شب رفتہ کے بعد'' کے زیر عنوان جو مجموعہ ترتیب دیا اس میں شب رفتہ کے دور کے کچھ کلام کا انتخاب اور اس کی اشاعت کے بعد کی ہوئی نظمیں یکجا کر دیں۔ اگر چہ یہ ترتیب مجید امجد کی منشا کے مطابق نہیں تھی تاہم غنیمت تھی۔ مشکل یہ آ پڑی کہ اس میں اغلاط کی بھرمار تھی۔ میں نے بڑی محنت سے اس کا اغلاط نامہ تیار کیا تھا مگر یہ کتاب یوں غائب ہوئی کہ بعد میں کہیں نظر نہیں آئی۔ کلیات کی ترتیب نو میں مجید امجد کی خواہش کے مطابق ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء کا کلام ''امروز'' کے نام سے اس حصے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی بیشتر نمائندہ نظمیں اس میں موجود ہیں۔

فردا

۱۹۶۸ء میں مجید امجد ''فعلن فعلن'' کے آہنگ سے مکمل طور پر مسحور ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے یہ واردات میر تقی میر پر بھی گزری تھی جنہوں نے اس بحر میں دو تین سو غزلیں لکھ ڈالی تھیں۔ میر کے بعد یہ بحر امجد کے مزاج کو راس آئی۔ چنانچہ وہ چھ سات سال تک

تمام نظمیں اسی بحر میں لکھتے چلے گئے۔ ان نظموں کے بارے میں عام قاری کی رائے ہے کہ یہ ان کی کمزور نظمیں ہیں جبکہ بعض سنجیدہ قارئین اور وسیع المطالعہ ناقدین کے خیال میں یہ ان کی بہترین تخلیقات ہیں۔ بہر حال یہ مستقبل کی نظمیں ہیں اور ان کی حیثیت کا تعین آنے والا زمانہ کرے گا۔

مذکورہ بالا چاروں حصوں میں سے ''شب رفتہ'' اور ''روز رفتہ'' قریب قریب ایک ہی زمانی وقفے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ۱۹۳۲ء تا ۱۹۵۸ء کے دوران تخلیق ہوئے ہیں۔ انھیں الگ کرنے کا جواز وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کر دیا گیا ہے۔ ''امروز'' اور ''فردا'' میں وہ کلام ترتیب دیا گیا ہے جو ۱۹۵۸ء سے ۱۹۷۴ء کے درمیان صفحہ قرطاس پر منتقل ہوا ہے اور چونکہ دو مختلف طرز اور اسلوب رکھتا ہے اس لئے دو الگ الگ حصوں میں مرتب کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ''شب رفتہ'' مجید امجد کا اپنا رکھا ہوا نام ہے جبکہ ''روز رفتہ''، ''امروز'' اور ''فردا'' کے عنوانات مرتب نے قائم کیے ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لیے تمام کلام پر سنین تخلیق درج کر دیے گئے ہیں۔

کلیاتِ مجید امجد کی اشاعتِ اوّل کے وقت اس کے ناشر اور معروف شاعر جناب خالد شریف نے ''عرضِ ناشر'' کے زیرِ عنوان میرے اس کام کو ذیل کے الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا تھا:

''تین سال قبل جب میں نے ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب سے مجید امجد کے کلام کی ترتیب و تدوین کی درخواست کی تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام کو اس قدر سنجیدگی سے لیں گے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ خواجہ صاحب کے پاس مجید امجد کا کچھ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ پھر یاد دہانیوں' تقاضوں اور ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ جو چلا تو معلوم ہوا کہ مجید امجد کا سارا مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام خواجہ صاحب کو حفظ ہے۔ مسودے کی تیاری' کتابت شدہ مواد کی پروف ریڈنگ اور بعد کے مراحل میں انہوں نے جس باریک بینی اور عرق ریزی سے کام لیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اُن کی اس توجہ کے باعث ہم میں سے

چند دوست یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ خواجہ صاحب کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تو دراصل اس کام پر ملنی چاہیے تھی"۔

ان کے یہ جملے میرے لیے اعزاز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر میری محنت، تگ و دو اور عرق ریزی اعزازی ہی رہی۔

اس موقع پر مناسب ہوگا کہ میں نے مجید امجد کے کلام کو جمع کرنے اور ترتیب دینے میں جو محنت اور جستجو کی اس کا ایک سرسری حال بیان کر دوں۔

۱۹۷۲ء میں میں نے مجید امجد کا ایک انٹرویو ساہیوال میں ان کے مکان پر ریکارڈ کیا تھا۔ اس وقت میں نے انھیں کسی اچھے ناشر سے ایک یا دو مجموعے شائع کروانے کی پیشکش کی۔ وہ راضی ہو گئے اور وعدہ کیا کہ وہ دو مجموعوں کو حتمی شکل دیں گے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ایک مجموعہ شب رفتہ کے بعد سے ۱۹۶۸ء تک کے کلام پر مشتمل ہو اور دوسرا مجموعہ "فعلن فعلن" والی بحر میں کہی گئی نظموں سے ترتیب پائے۔ ان دنوں مجید امجد کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ میں نے احتیاطاً دو موٹی موٹی کاپیاں خریدیں اور ان میں ان کا تمام کلام مختلف ذرائع سے حاصل کر کے لکھنا شروع کر دیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو یہ کاپیاں بھر چکی تھیں۔ اس دوران میری ملاقات کسری منہاس (اب مرحوم) سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ان سے میرے نیازمندانہ مراسم استوار ہو گئے۔ انہوں نے مجھے نہ صرف "عروج" جھنگ کی فائلیں عطا کیں بلکہ امجد کا چند نادر کلام بھی فراہم کیا۔ پھر جناب جاوید قریشی کی عنایت سے مجید امجد کے مسودات میری نظر سے گزرے۔ میں نے اس سارے انمول خزانے کو بہت وقت صرف کر کے ترتیب دیا۔ بعض نظموں کے سنین تخلیق امجد صاحب نے تحریر نہیں کیے تھے۔ انھیں تلاش کر کے خلا پر کیے۔ بڑی جستجو کے بعد میں اس قابل ہوا کہ تمام کلام کو تاریخی ترتیب سے یکجا کر سکوں۔ اس کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ امجد صاحب اپنے کلام پر مسلسل محنت کرتے رہتے تھے۔ ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل غیر مختتم تھا۔ نتیجہ یہ کہ بعض نظموں کے ایک سے زیادہ "ورژن" موجود تھے۔ ان میں سے کون سا "ورژن" شاعر کی منشا کے مطابق تھا اور کون سا نہیں تھا؟ اس الجھن کو سلجھانا سہل نہیں تھا۔ اکثر جگہ میں نے آخری "ورژن" کو ترجیح دی مگر چند نظموں میں اولیں ورژن بہتر معلوم ہوا اس

لیے اُس کو اختیار کیا گیا۔ مجید امجد کی بہت سی نظموں میں لفظی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ رسائل میں پہلی دفعہ اور طرح سے شائع ہوئی ہیں اور بعد میں چند الفاظ تبدیل کر کے قدرے مختلف صورت میں چھپوادی گئی ہیں۔ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کہ آگے پیچھے مختلف رسائل میں چھپنے والی نظموں میں سے آخری ورژن کون سا ہے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے چند ماہ بعد چھپنے والی نظم ترمیم کے مراحل سے چند ماہ پہلے گزر چکی ہو۔ ان اُلجھنوں کو تقابلی مطالعے کے بعد سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک اور بڑا مسئلہ بعض الفاظ کی صحت یا عدم صحت کا ہے۔ امجد کے ہاں متعدد غیر مستعمل الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ بعض الفاظ اور تراکیب انہوں نے خود تراش لی ہیں۔ اس لئے رسائل میں مدیر اور کاتب انہیں درست پڑھ نہیں سکے۔ چنانچہ متعدد الفاظ بار بار غلط نقل ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ اس قسم کی لفظی اُلجھنوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے سلجھایا جائے۔ اس طول کلامی کے بعد شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ کلیات مجید امجد محض جلد بازی میں جمع کیا ہوا پشتارہ نہیں ہے بلکہ تلاش، تجسس، تحقیق اور توجہ سے 'شیرازہ بند' کیا ہوا مجموعہ ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کلام مجید امجد پر تنقید کے لیے ایک مضبوط بنیاد ثابت ہو چکا ہے۔ اُمید ہے اس کا موجودہ ایڈیشن پہلے سے زیادہ پسند کیا جائے گا۔

الحمد پبلی کیشنز کے صفدر حسین صاحب میرے عزیز دوست ہیں۔ کلیاتِ مجید امجد کی یہ اشاعتِ نو ان کے ذوقِ طباعت کی عکاسی کرتی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس ضخیم کلیات کی اشاعت کا اہتمام کیا اور اسے عام قاری کی دسترس میں رکھنے کی سعی کی۔

خواجہ محمد زکریا

۶ ستمبر ۲۰۰۳ء

موجِ تبسم

ستاروں کو نہ آتا تھا ابھی تک مسکرا اٹھنا
دیے بن کر یوں ایوانِ فلک میں جگمگا اٹھنا
حسیں غنچوں کے نیلیں لب تھے ناواقف تبسم سے
چمن گونجا نہ تھا اب تک عنادل کے ترنم سے
نہ پروانے تھے جلتے شمعِ سوزاں کے شراروں میں
نہ آئی تھی ابھی ہمت یہ ننھے جاں نثاروں میں
ابھی گہوارۂ ابرِ بہاری میں وہ سوتی تھی
نہ بجلی یوں شرر بار اور خرمن سوز ہوتی تھی
نہ اب تک ارتعاشِ نغمہ تھا بربط کے تاروں میں
نہ اب تک گونجنے پائے تھے نغمے نغمہ زاروں میں
نہ اب تک آبشاریں پتھروں سے سر پٹکتی تھیں
نہ اب تک رونے دھونے میں یوں راتیں اُٹھی کٹتی تھیں
سمجھتا تھا نہ دل اب تک نشاط و رنج و کلفت کو
نہ چھیڑا تھا ابھی تک اس نے اپنے سازِ اُلفت کو

ابھی تیروں کو ترکش ہی میں ڈالے دیوتا کیوپڈ
کھڑا خالی کماں کو تھا سنبھالے دیوتا کیوپڈ
جہاں پر حکمراں تھی ایک ہیبت خیز خاموشی
مصیبت ریز، خوف آمیز، ہول انگیز خاموشی
یکا یک بجلیاں ٹوٹیں فغان بزم ہستی میں
ہزاروں جاگ اُٹھے فتنے اس دُنیا کی بستی میں
خموش و پرسکون عالم میں دوڑی روحِ بیتابی
ہوئی ہر ذرّۂ رقصاں میں پیدا شانِ سیمابی
سمندر کی روانی ہوگئی تبدیل طوفاں میں
پڑا نورس گلوں کے قہقہوں کا غُل گلستاں میں
شبستانوں سے رندوں کی صدائے ہاؤہو اُٹھی
دبستانوں سے بُلبل کی نوائے ہاؤہو اُٹھی
ٹپکنے لگ گئی سر جوئے کہساری چٹانوں سے
مچل کر بجلیاں ٹوٹیں زمیں پر آسمانوں سے
اُٹھایا شور افزا آبشاروں نے رباب اپنا
سنایا گا کے سبزے کو گزشتہ شب کا خواب اپنا
حیاتِ تازہ یوں دوڑی دلوں کی کائناتوں میں
کہ جیسے برق چمکے برشگالی کالی راتوں میں

یم ہستی میں کیف و نور کا سیلِ رواں آیا
ریاضِ دہر میں اک رنگ و بو کا کارواں آیا
جہاں بس رہ گیا بن کر طلسمِ کیف و سرمستی
نشوں کی ایک دُنیا اور کیفیات کی بستی
فلک اِک گنبدِ زریں زمیں اک بقعہ نوریں
یہ ساری کائناتِ شش جہت اِک جلوۂ رنگیں
یہ موجِ بحرِ امکاں جلوۂ موجِ تبسم ہے
چمک کر جو ترے لب پر فروغ افزائے عالم ہے
تبسم جس کی رنگینی ترے ہونٹوں پہ رقصاں ہے
تبسم آہ جس کا رقص مضرابِ رگِ جاں ہے

(۱۹۳۲ء)

اقبال

اقبال! کیوں نہ تجھ کو کہیں شاعرِ حیات
ہے تیرا قلب محرمِ اسرارِ کائنات

سرگرمی دوام ہے تیرے لئے حیات
میدانِ کارزار ہے تجھ کو یہ کائنات

مشرق تری نظر میں ہے اُمید کا افق
مغرب تری نگاہ میں ہے غرقِ سیّٓات

یورپ کی ساری شوکتیں تیرے لئے سراب
ہنگامۂ تمدنِ افرنگ بے ثبات

اسلامیوں کے فلسفے میں دیکھتا ہے تو
مظلوم کائنات کی واحد رہِ نجات

تیرا کلام جس کو کہ بانگِ درا کہیں
ہیں اُسکے نقطے نقطے میں قرآن کے نکات

بھولے ہوؤں کو تو نے دیا درسِ زندگی
زیبا ہے گر کہیں تجھے خضرِ رہِ حیات

سینے میں تیرے عشق کی بیتاب شورشیں
محفل میں تیری قدس کی رقصاں تجلیات

عُریاں تری نگاہ میں اسرارِ کن فکاں
مضمر ترے ضمیر میں تقدیرِ کائنات

دُنیا کا ایک شاعرِ اعظم کہیں تجھے
اسلام کی کچھار کا ضیغم کہیں تجھے

(۱۹۳۳ء)

ہوائی جہاز کو دیکھ کر

یہ تہذیب اور سائنس کی ترقی کا زمانہ ہے
رہے گا یوں بھلا کب تک درندوں کی طرح انساں
یہ علم و دانش و حکمت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے
ہوا میں لگ گیا اُڑنے پرندوں کی طرح انساں

وہ دیکھو ہیں فضا میں مائلِ پرواز طیارے
گرجتے، گھومتے، گرتے، سنبھلتے اور چکراتے
فضائے آسماں کی سیر کرنے والے سیارے
وہ دیکھو جارہے ہیں گنگناتے، گونجتے، گاتے

اُدھر وہ خوش نصیب اور صاحبِ اقبال انساں ہیں
جنھیں بخشی گئی اِن برق پاروں کی عناں گیری
اُدھر وہ ذوقِ علم و فن سے مالا مال انساں ہیں
جنھیں سونپی گئی دنیائے حکمت کی جہانگیری

اِدھر ہم لوگ ہیں کیفیتِ فکر و نظر جن کی
جہاں میں قوتِ پرواز سے محروم رہتی ہے
اِدھر ہم لوگ ہیں دُنیا میں جنکی مضمحل ہستی
حیاتِ جاوداں کے راز سے محروم رہتی ہے

اگر یہ آرزو انساں کے دل میں جلوہ گر ہوگی
کہ چھن جائیں نہ عیشِ سرمدی کی نزہتیں اُس سے
تو اس کی زندگی تابندہ تر پائندہ تر ہوگی
فقط سعیِ مسلسل سے فقط ذوقِ تجسس سے

(۱-۱۲-۱۹۳۴)

آہ یہ خوش گوار نظارے!

سامنے کیا ہے اک پہاڑی ہے خوب صورت، بلند اور شاداب
اس کی چیں بر جبیں چٹانوں پر رقص کرتے ہیں سایہ ہائے سحاب
اس کی خاموش وادیاں، یعنی ایک سویا ہُوا جہانِ شباب
اس کی سقفِ بلند کے آگے آسماں ایک سرنگوں محراب
شام کے وقت کوہ کا منظر جیسے بھولا ہوا طلسمی خواب
گھومتے، ناچتے ہوئے چشمے پھوٹتا، پھیلتا ہُوا سیماب
دُوب کی رینگتی ہوئی بیلیں پتھروں سے پٹے ہوئے تالاب

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

چیلوں کے اُف یہ بے شمار درخت — اور یہ ان کی عنبریں بو باس
سنبلیں کونپلوں سے چھنتے ہوئے — یہ نسیم شمال کے انفاس
سایہ ہائے دراز کے نیچے — سرنگوں جھاڑیوں کا خوف و ہراس
چیلوں کی چوٹیوں پہ صبح کے وقت — سبز پتوں کا زرنگار لباس
یہ دُھواں جھونپڑوں سے اُٹھتا ہُوا — کوہ کے اس طرف اُفق کے پاس
یہ برستی ہُوئی گھٹا کا سماں — قلب شاعر پہ بارش احساس

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

مرغزاروں میں تا بحد نظر — لطف افزا فضا مہکتی ہوئی
شب کو دہقاں کے تنگ جھونپڑے سے — سُرخ سی روشنی جھلکتی ہوئی
ابر میں کوندتی ہوئی بجلی — دامن آتشیں جھٹکتی ہوئی
کوہ کی سربلند چوٹی سے — اک نئی تازگی ٹپکتی ہوئی

آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

وادیوں کا ہر ایک خار حقیر　　امتدادِ زمانہ کی تصویر
قدسیوں کی ادائے کج نگہی　　صبح کے آفتاب کی تنویر
جلوہ ہائے شفق کی عُریانی　　ایک رنگین خواب کی تعبیر
زمہریری ہوا کے جھونکوں سے　　ڈبڈبائی ہوئی سی چشم اثیر
آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

چاہتا ہوں کہ اپنی ہستی کو　　سرمدی کیف میں ڈبو جاؤں
چاہتا ہوں کہ ان فضاؤں کی　　وسعتِ بیکراں میں کھو جاؤں
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں　　جذب ہو جاؤں جذب ہو جاؤں
آہ یہ خوش گوار نظارے
خلد کے شاہکار نظارے

(۱۹۳۴ء)

محبوب خداؐ سے

نو بہارِ گلستانِ معرفت
یعنی اے روح و روانِ معرفت

تیرے دل میں جلوۂ ربِ جمیل
تیری محفل میں سرودِ جبرئیل

اہتمام و اہتزازِ کائنات
تیری اک ادنیٰ نگاہ التفات

قرب یابِ درگہِ یزداں ہے تو
ساقیِ خُمِ خانۂ عرفاں ہے تو

جھک رہا ہے تیرے در پر آسماں
چومتا ہے تیرے قدموں کو جہاں

ترے دم سے دل کی کلیاں کھل گئیں
بدنصیبوں کو مرادیں مل گئیں

تیری چوکھٹ پر جھکی جس کی جبیں
ہو گیا اس کے جہاں زیرِ نگیں

میں سمجھتا ہوں کہ تیری خاکِ پا
کیمیا ہے کیمیا ہے کیمیا

مجھ پہ گر تو لطف فرمائی کرے
بخت میرا نازِ دارائی کرے

میں بھی ہوں اک بندۂ عصیاں شعار
کشتۂ جور و جفائے روزگار

میں بھی تیرا بستۂ فتراک ہوں
کس قدر غمگین ہوں غمناک ہوں

میں زمانے بھر سے ٹھکرایا گیا
میں ہر اک محفل سے اُٹھوایا گیا

درگہِ عالم سے دھتکارا ہوا
بخت اور تقدیر کا مارا ہُوا

اب ترے دربار میں آیا ہوں میں
دل میں لاکھوں حسرتیں لایا ہوں میں

مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
حاصلِ سلطنتِ عالمِ امکانی ہے
جب مری زیست سے ٹکرا کے بجھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہُوا
تب میں سمجھا' کہ یہ راہیں' یہ گھروندے' یہ چھکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غمِ جاوید کی اِک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغلِ نمک رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں' کسی موڑ' کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اُڑتا ہے سمٹتا ہے تو ڈھیرے ڈھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ برابط کی کوئی لرزشِ پنہانی ہے

جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے' زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو' کس کی یہ آواز ہے' پہچانی ہے؟

تجھ کو میری بے کسی کا واسطہ
اپنی شانِ خسروی کا واسطہ

مر رہا ہوں زندگی کا جام دے
رحمتِ جاوید کا پیغام دے

اب زمانے میں مرا کوئی نہیں
آسرا تیرے سوا کوئی نہیں

اک فقط درد آشنا تو ہی تو ہے
میرے دل کا مدعا تو ہی تو ہے

جب ترے دربار میں آتا ہوں میں
جب تری سرکار میں آتا ہوں میں

عظمتِ مفقود کو پاتا ہوں میں
منزلِ مقصود کو پاتا ہوں میں

تیرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہوں میں
جھولیاں بھر بھر کے لے جاتا ہوں میں

زندگی کی زندگی تو ہی تو ہے
روح کی تابندگی تو ہی تو ہے

میرے دل کو مہبطِ انوار کر
مجھ کو بھی بینندۂ اسرار کر

(۱۹۳۴ء)

رازِ گراں بہا

نہ رہنما سے تعلق نہ راستہ معلوم
ترے جنونِ تجسس کا منتہا معلوم

نہ آرزوئے ترقی نہ جستجوئے کمال
تری حیات کا مقصد ہے کیا خدا معلوم

یہی ہے حال اگر پستی عزائم کا
مآلِ خواہشِ تکمیل ارتقا معلوم

نہاں ہے محنت پیہم میں راحت جاوید
نہیں ہے تجھ کو یہ رازِ گراں بہا معلوم

تو اجتماعِ مصائب سے ڈر رہا ہے کیوں
نہیں تحمل آفات کا صلا معلوم!

حریم قدس کی رنگینیوں کا مرکز ہے
وہ دل کہ جس کو نہیں خوفِ ماسوا معلوم

(۲۴-۱۲-۱۹۳۴)

گاؤں

یہ تنگ و تار جھونپڑیاں گھاس پھوس کی
اب تک جنھیں ہوا نہ تمدن کی چھو سکی

ان جھونپڑوں سے دُور اور اس پار کھیت کے
یہ جھاڑیوں کے جھنڈ یہ انبار ریت کے

یہ سادگی کے رنگ میں ڈوبا ہُوا جہاں
ہنگامہ جہاں ہے سکوں آشنا جہاں

یہ دوپہر کو کیکروں کی چھاؤں کے تلے
گرمی سے ہانپتی ہوئی بھینسوں کے سلسلے

ریوڑ یہ بھیڑ بکریوں کے اُونگھتے ہُوئے
جھک کر ہر ایک چیز کی بو سونگھتے ہوئے

یہ آندھیوں کے خوف سے سہمی ہوئی فضا
جنگل کی جھاڑیوں سے سنکتی ہوئی ہَوا

یہ شام کے مناظر رنگیں کی خامشی
اور اس میں گونجتی ہوئی جھینگر کی راگنی

بچے غبارِ راہگزر پھانکتے ہوئے
میدان میں مویشیوں کو ہانکتے ہوئے

برفاب کے دفینے اُگلتا ہوا کنواں
یہ گھنگھروؤں کی تال پہ چلتا ہوا کنواں

یہ کھیت، یہ درخت، یہ شاداب گرد و پیش
سیلاب رنگ و بو سے یہ سیراب گرد و پیش

مست شباب کھیتیوں کی گلفشانیاں
دوشیزۂ بہار کی اُٹھتی جوانیاں

یہ نزہت مظاہر قدرت کی جلوہ گہ
ہاں ہاں یہ حسن شاہد فطرت کی جلوہ گہ

دُنیا میں جس کو کہتے ہیں گاؤں یہی تو ہے
طوبیٰ کی شاخ سبز کی چھاؤں یہی تو ہے

(۲۴-۷-۱۹۳۵)

حالی

مسدس کا مصنف شاعر جادو بیاں حالی — وہ حالی عندلیب گلشن ہندوستاں حالی

قلم کی نوک سے جس نے رباب روح کو چھیڑا — حریم قدس کا وہ مطرب شیریں زباں حالی

جہاں آرا نظر جس کی رموز آگاہ دل جس کا — وہ اسرار و معارف کا محیط بیکراں حالی

فلک جسکو کرے سجدے زمیں جسکے قدم چومے — وہ حالی ہاں وہی شخصیت گردوں نشاں حالی

وہی حالی جسے دانائے راز زندگی کہہ دیں

جسے سرمایہ سوز و گداز زندگی کہہ دیں

وہ حالی چھوڑ کر جس نے کہانی بلبل و گل کی — بھلا کر قلقل وجد آفریں میخانہ مل کی

نئے انداز سے چھیڑی فضائے بزم عالم میں — حدیث دل فروز اسلام کے شان و تجمل کی

وہ حالی توڑ کر جس نے طلسم گیسوئے پیچاں — دکھائی شان موج زندگانی کے تسلسل کی

وہ جس نے قصہ ہائے نرگس بیمار کے بدلے — سنائی داستاں اوضاع ملت کے تعطل کی

وہ حالی جس کے آنے سے جہاں میں انقلاب آیا

وہ جس کے شعر سے ہندوستاں میں انقلاب آیا

وہی حالی جو سوتوں کو جگانے کیلئے آیا　　وہی حالی جو مُردوں کو جِلانے کیلئے آیا

جسے صحرائے بطحا کے حُدی خوانوں نے چھیڑا تھا　　نئی لے میں اسی نغمے کو گانے کیلئے آیا

وہ حالی ہاں وہ مردِ حق جو کفرستان عالم میں　　خدا کے نام کا ڈنکا بجانے کیلئے آیا

وہ حالی وہ معلم مکتب اخلاق ملت کا　　جو ہر انسان کو انساں بنانے کیلئے آیا

وہ حالی جو علمدار وقار زندگانی ہے

سرور جاودانی ہے بہار زندگانی ہے

وہی حالی جو اذکار ونصیحت کیلئے آیا　　وہی حالی جو ارشاد و ہدایت کیلئے آیا

وہی شاعر کہ جس نے شعر کی طرزِ کہن بدلی　　وہی ناقد جو تبلیغ صداقت کیلئے آیا

وہی رہبر کہ جس نے گمرہوں کی رہنمائی کی　　وہ مصلح جو فلاح ملک وملت کیلئے آیا

وہ فخر ایشیا' مہر سپہر شاعری حالی　　وہ مردِ حق جو اظہارِ حقیقت کیلئے آیا

وہ جس کے فکر کیف اندوز نے موتی لٹائے ہیں

وہ جس کے خامہ سحر آفریں نے گل کھلائے ہیں

وہی حالی کہ جو آئینہ دار باکمالی ہے　　نظیر بے نظیری ہے مثال بیمثالی ہے

وہی حالی کہ جسکی شاعری سلک لآلی ہے　　زباں آب زلالی ہے بیاں سحر حلالی ہے

وہ جسکے قلب میں ہنگامہ دردِ نہانی ہے　　وہ جسکی روح میں سرمستی تخئیل عالی ہے

ہے گر قومیت ہندوستاں کا ترجماں کوئی　　یقیں رکھو یقین رکھو وہ حالی ہے وہ حالی ہے

اسی حالی اسی حالی کی یہ صد سالہ برسی ہے

جبھی تو چار سُو شانِ جمالی جلوہ گری ہے

اسی حالی اسی حالی کا ہے یہ جشن صد سالہ
جبھی تو آج ہے ہندوستاں کی شان دوبالا

اسے پیدا ہوئے سَو سال گزرے ہیں مگر اب بھی
جسے دیکھو وہی اس کی محبت میں ہے متوالا

ابھی تک کہ جہاں بے امتیاز مذہب و ملت
کلام حالی مرحوم کا ہے پوجنے والا

ابھی تک ہے وہی جسکی ضیاریزی جلوہ خیزی
کلام حالی مرحوم ہے وہ لولوئے لالا

کلام حالی مرحوم اک گنجِ معانی ہے
جو ادبیات میں اک شاہکار غیر فانی ہے

ابھی تک چل رہا ہے میکدے میں جام حالی کا
ابھی تک مرکز تقدیس ہے پیغام حالی کا

ابھی بھولے نہیں اہل جہاں احسان حالی کے
زمیں سے آسماں تک غلغلہ ہے عام حالی کا

اسی جانب رواں ہیں قافلے اقوام عالم کے
بڑھا جس منزل مقصد کی جانب گام حالی کا

ابھی تک ان فضاؤں میں ہے مضمر روح حالی کی
ابھی تک چٹکیاں لیتا ہے دل میں نام حالی کا

ابھی تک آرہی ہے عرش سے آواز حالی کی
ابھی تک کان سنتے ہیں نوائے راز حالی کی

سپہر زندگی کا ضوفشاں ناہید ہے حالی
نہیں، سرِ مطلع امید کا خورشید ہے حالی

پیام ولولہ انگیز اس کا مٹ نہیں سکتا
جہانِ زندگی میں زندۂ جاوید ہے حالی

اگر اب بھی نہیں سمجھے تو لو میں برملا کہہ دوں
اجی! اک آنے والے دور کی تمہید ہے حالی

چلے گا حشر تک بزمِ جہاں میں جام حالی کا
رہے گا ثبت لوح کن فکاں پر نام حالی کا

(۱-۱۱-۱۹۳۵)

لہر انقلاب کی

حالت بدل رہی ہے جہانِ خراب کی
لہرا رہی ہے دہر میں لہر انقلاب کی

تخریب جس کی حدت وشدت کا نام ہے
دنیا میں پھر نمود ہے اُس اضطراب کی

سرمائے کے نظام کا انجام ہے قریب
اب اس کی زندگی ہے کہ ہستی حباب کی

پہنچا ہے اختتام پہ دورِ ملوکیت
حد بھی تو ہو کوئی ستم بے حساب کی

بوڑھوں کی مصلحت کو بھلا پوچھتا ہے کون
سرجوشیاں ہیں جوش پہ روحِ شباب کی

اس عہد کے جوانِ جواں عزم کے لیے
تہذیب نو ہے ایک تجلی سراب کی

پھر جاگ اُٹھا ہے جذبۂ آزادیٔ وطن
تعبیر اور کیا ہو غلامی کے خواب کی

امجدؔ تو آنے والے تغیر کو بھانپ جا
مستقبلِ مہیب کی ہیبت سے کانپ جا

(۱۹۳۶-۱۰)

محرومِ ازل

عرصۂ کونین میں کچھ بھی نہیں میرے لیے
خاک ہیں فرشِ زمیں عرشِ بریں میرے لیے

اِک جہاں کے واسطے ہے اِک جہانِ انبساط
اور ہے اشکوں میں ڈوبی آستیں میرے لیے

دوسروں کے واسطے تاج و سریر و آستاں
بندۂ مجبور کی عاجز جبیں میرے لیے

رات بھر دورِ شرابِ ارغواں ان کے لیے
صبح کو محفل کے خالی ساتگیں میرے لیے

اس خیالِ خام کو رہنے بھی دے اختر شناس
آسماں کی وسعتوں میں کچھ نہیں میرے لیے

(۱۹۳۶-۱۰-۱۶)

غزل

عشق کی ٹیسیں جو مضرابِ رگِ جاں ہوگئیں
رُوح کی مدہوش بیداری کا ساماں ہوگئیں

پیار کی میٹھی نظر سے تو نے جب دیکھا مجھے
تلخیاں سب زندگی کی لطف ساماں ہوگئیں

اب لبِ رنگیں پہ نوریں مسکراہٹ؟ کیا کہوں
بجلیاں گویا شفق زاروں میں رقصاں ہوگئیں

ماجرائے شوق کی بے باکیاں ان پر نثار
ہائے وہ آنکھیں جو ضبطِ غم میں گریاں ہوگئیں

چھا گئیں دشواریوں پر میری سہل انگاریاں
مشکلوں کا اک خیال آیا کہ آساں ہوگئیں

(۲۴-۲-۱۹۳۷)

نذرِ محبت

(سانیٹ)

میں روتا ہوں مری آنکھوں سے جو آنسو ٹپکتے ہیں
پروتے ہیں لڑی سی موتیوں کی "تارِ مژگاں میں
یہ موتی جن میں نورِ قدس کے جلوے جھلکتے ہیں
یہ موتی جو ستارے ہیں عروسِ شب کے داماں میں
یہ موتی جو فروغِ سوزِ الفت سے دہکتے ہیں
بکا کرتے ہیں جیبوں آستینوں کی جو دکاں میں

مری ہستی کا سرمایہ ہیں یہ نور آفریں موتی
کہ سلکِ کہکشاں بھی جن کی قیمت ہو نہیں سکتی
ابھی ان موتیوں کو عمر بھر دامن میں رولوں گا
اور آخر ان کو اک رنگین مالا میں پرولوں گا
ترے قدموں میں گر کر پریم مندر کی حسیں دیوی
اسی مالا کو میں ترے گلے میں لا کے ڈالوں گا
اور اپنی زندگی کے آخری مقصد کو پالوں گا

(۱۶-۴-۱۹۳۷)

پسِ پردہ

میری قیام گاہ کی سمت جنوب مغربی
جس میں کہ خار و خس کی ہے چھوٹی سی ایک جھونپڑی
اُس کے درِ شکستہ پہ پردہ ہے اک پھٹا ہوا
چھید سے جس کے جھانک کر دیکھ رہی ہے (آمنہ)
گائے کا دودھ دوہ کر رکھ رہی ہے وہ آگ پر
میرے قدم کی چاپ پر آ گئی در پہ بھاگ کر
سہمی ہوئی کھڑی ہے وہ ساحرۂ لطیف جاں
سانس سے اس کی لرزشیں پردۂ در پہ ہیں عیاں
دیکھ رہی ہے وہ مجھے ہنستی ہوئی نگاہ سے
ہنستی ہوئی نگاہ کی تابش بے پناہ سے

نو وارد

نازنیں! اجنبی شہر محبت ہوں میں
میں ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں

دیدۂ شوق کی بیباک نگاہوں پہ نہ جا
کیا کروں جرأت گفتار سے ناواقف ہوں

چل پڑا ہوں ترے دامن کو پکڑ کر لیکن
اس کٹھن جادۂ پُر خار سے ناواقف ہوں

مست ہوں عشرت آغاز کی سرمستی میں
میں ابھی عاقبت کار سے ناواقف ہوں

سونگھنی ہے تری زلفوں سے ابھی بوئے جنوں
ابھی دامن کے پھٹے تار سے ناواقف ہوں

دیکھ لوں تجھ کو تو بے ساختہ پیار آتا ہے
پیار آتا ہے مگر پیار سے ناواقف ہوں

دل میں یہ جذبۂ بیدار ہے کیا؟ تو ہی بتا
میں تو اس جذبۂ بیدار سے ناواقف ہوں

اک مسافر ہوں ترے دیس میں آ نکلا ہوں
اور ترے دیس کے اطوار سے ناواقف ہوں

(۱۴-۹-۱۹۳۷)

جھنگ

یہ خاکداں جو ہیولیٰ ہے ظلمتستاں کا — یہ سرزمیں جو ہے نقشہ جحیم سوزاں کا
یہ تنگ و تیرہ و بے رنگ و بو دیارِ مہیب — یہ طرفہ شہر عجیب و غریب و خفتہ نصیب
یہاں خیال ہے محروم اہتزازِ حیات — یہاں حیات ہے دوزخ کی ایک کالی رات
یہاں پہ دردِ دروں کی دوا نہیں ملتی — یہاں پہ قلب و نظر کو غذا نہیں ملتی
یہاں کلیدِ حقیقت نہیں کسی کے پاس — یہاں کے تحفے حسد اور عداوت اور افلاس
یہاں ارادہ و ہمت کی وسعتیں محدود — یہاں عروج و ترقی کے راستے مسدود
ہر اک بشر ہے یہاں تنگدستیوں کے قریب — بلندیوں سے بہت دور پستیوں کے قریب
یہاں نہ روح کو راحت، یہاں نہ دل کو سرور — یہاں ہے طائرِ پر بستہ آدمی کا شعور
یہاں نہ پرورشِ شوقِ علم کے امکاں — یہاں نہ تربیتِ ذوقِ شعر کے ساماں

کبھی سے پاپ کی بھٹی میں سڑ رہا ہوں میں
ندیم جھنگ سے اب تنگ آ گیا ہوں میں

(۸-۱۰-۱۹۳۷)

تیرے بغیر

زندگی بھولا ہوا سا خواب ہے تیرے بغیر
سازِ دل اک سازِ بے مضراب ہے تیرے بغیر
روح برمائی ہوئی بے تاب ہے تیرے بغیر
آنکھ خوں روتی ہوئی بے خواب ہے تیرے بغیر
ضبطِ غم دشوار ہے آسان ہے جو کچھ بھی ہو
ضبطِ غم کرنے کی کس کو تاب ہے تیرے بغیر
کاش ہو معلوم تجھ کو ساقیِ جامِ حیات
زندگی اک جرعۂ زہراب ہے تیرے بغیر
ملگجی پلکوں پہ رسوا، رائیگاں، رم آشنا
دل کا اک اک قطرۂ خوناب ہے تیرے بغیر
پھر مرے جذبات کا وہ پر سکوں بحرِ رواں
یم بہ یم گرداب در گرداب ہے تیرے بغیر

میری پاکیزہ جوانی صرفِ عصیاں ہو نہ جائے

جنسِ تقدیسِ وفا نایاب ہے تیرے بغیر

چاند کی کرنوں کے زینوں پر قدم دھرتی ہوئی

آ بھی جا سوئی شبِ مہتاب ہے تیرے بغیر

آ کہ پھر اس آسماں کو حکم دیں سجدے کا ہم

دشمنِ جاں گردشِ دولاب ہے تیرے بغیر

(۲۷-۱۰-۱۹۳۷)

یہی دُنیا......؟

عشق پیتا ہے جہاں خونابہ دل کے ایاغ
آنسوؤں کے تیل سے جلتا ہے اُلفت کا چراغ
جس جگہ روٹی کے ٹکڑے کو ترستے ہیں مدام
سیم و زر کے دیوتاؤں کے سیہ قسمت غلام
جس جگہ حبِ وطن کے جذبے سے ہو کر تپاں
سُولی کی رسی کو ہنس کر چومتے ہیں نوجواں
جس جگہ انسان ہے وہ پیکرِ بے عقل و ہوش
نوچ کر کھاتے ہیں جس کی بوٹیاں مذہب فروش
جس جگہ یوں جمع ہیں تہذیب کے پروردگار
جس طرح سڑتے ہوئے مردار پر مردار خوار

جس جگہ اٹھتی ہے یوں مزدور کے دل سے فغاں
فیکٹری کی چمنیوں سے جس طرح نکلے دھواں

جس جگہ سرما کی ٹھنڈی شب میں ٹھٹھرے ہونٹ سے
چومتی ہے رو کے بیوہ گال سوتے لال کے

جس جگہ دہقاں کو رنج محنت و کوشش ملے
اور نوابوں کے کتوں کو حسیں پوشش ملے

تیرے شاعر کو یقیں آتا نہیں، ربّ العلا!
جس پہ تو نازاں ہے اتنا، وہ یہی دنیا ہے کیا؟

(۱۴-۱۲-۱۹۳۷)

شرط

تجھکو یہ ڈر ہے کہ ناموس گہِ عالم میں عشق کے ہاتھوں نہ ہو جائے تو بدنام کہیں!
آج تک مجھ سے جو شرما کے بھی تو کہہ نہ سکی وہ ترا راز زمانے میں نہ ہو عام کہیں!
کسی شب ایسا نہ ہو نالۂ بیتاب کیساتھ تیرے ہونٹوں سے نکل جائے مرا نام کہیں!
روزنِ در سے لگی 'منتظر آنکھوں' کا حال جا کے تاروں سے نہ کہدے شفقِ شام کہیں!
اسکی پاداش میں ساقیِ فلک چھین نہ لے مرے ہونٹوں سے ترے ہونٹوں کا یہ جام کہیں!
یہ تری شرطِ وفا ہے کہ وفا کا قصہ دیکھ! سن پائے نہ گردشِ گر ایام کہیں

ہاں مری رُوح پہ مسطور ہے یہ شرط تری
مجھے منظور ہے منظور ہے یہ شرط تری

تو یقین رکھ کہ ترے عشق میں جیتے جیتے عدم آباد کی آغوش میں سو جاؤں گا
ایک دن دل سے جب آوازِ شکست آئیگی اس کے آہنگِ فنا رقص میں کھو جاؤں گا
موت کے دیو کی آنکھوں سے ٹپکتا ہے جو جذب اس شعلۂ جاں سوز میں ہو جاؤں گا

اور خدا پوچھے گا وہ راز باصرار ترا
اس کے اصرار سے ٹکرائے گا انکار مرا

(۲۶-۱۲-۱۹۳۷)

اقبال

(۱)

مشعلِ زندگی کی ضو' اقبال　　رہبرِ دوجہاں جلو اقبال
محفلِ طور جس سے روشن تھی　　اسی شمعِ ازل کی ضو' اقبال
خس وخاشاکِ کفر کے حق میں　　ایک سیلابِ تند رو' اقبال
اُفقِ تیرۂ دوعالم پہ　　پرتوِ نورِ صبحِ نو' اقبال

شاعرِ زندگی پیام اقبال
زندہ و زندۂ دوام اقبال

(۲)

ساقیِ بادۂ حیات' اقبال　　مطربِ سازِ کائنات اقبال
موجِ تہذیبِ نو ہے جس کیلئے　　ورطۂ بحرِ سیّات اقبال
جس کے شعروں کا نقطہ نقطہ ہے　　لئے قرآن کے نکات اقبال
راہِ اسلام کو سمجھتا ہے　　وہ جو واحد رہِ نجات اقبال

رہ نمائے جہانیاں' اقبال
فخرِ ہندوستانیاں' اقبال

ثبت لوحِ جہاں پہ نام اس کا　　زندۂ جاوداں کلام اس کا

حشر تک گونجتا رہے گا یوں　　دہر میں سرمدی پیام اس کا

تا بدورِ فلک زمانے میں　　دور کرتا رہے گا جام اس کا

جس رہِ منزلِ حقیقت پر　　اٹھ چکا ہے خجستہ گام اس کا

تم بھی اس راستے پہ بڑھتے چلو

نردبانِ فلک پہ چڑھتے چلو

(۸-۱-۱۹۳۸)

مطربہ سے

فضا میں بحرِ موسیقی رواں معلوم ہوتا ہے — جہاں کا ذرہ ذرہ نغمہ خواں معلوم ہوتا ہے
سنبھلنے دے ذرا او مطربہ یہ نشتریں نغمہ — جگر کے زخم پر زخمہ کناں معلوم ہوتا ہے
یونہی گائے جا گائے جا ترا سوز آفریں دیپک — مری ہی زندگی کی داستاں معلوم ہوتا ہے
تو گاتی ہے تو میرے سامنے نظارۂ عالم — کسی فردوسِ رنگیں کا سماں معلوم ہوتا ہے

تو گاتی ہے تو آنکھیں کھول کر لیتی ہے انگڑائی
ربابِ دہر کے نغموں کی محو خواب رعنائی

تو گاتی ہے تو تیرے رخ پہ زلفیں جھوم جاتی ہیں — تو گاتی ہے تو تیری مدبھری آنکھیں بھی گاتی ہیں
تو گاتی ہے تو تیرے چنچنی ہونٹوں کی مہکاریں — شرابِ نغمہ کی سرمستیوں میں ڈوب جاتی ہیں
تو گاتی ہے تو گاتے وقت تیرے رُخِ تاباں پر — جمالِ زہرہ کی زیبائیاں جادو جگاتی ہیں
تو گاتی ہے تو تیری راگنی کی مست کن تانیں — مری رگ رگ کو نیشِ درد بن کر گدگداتی ہیں

مرے خلدِ تصور کی فضا کو ہمہمائے جا
یونہی گائے جا، گائے جا، یونہی گائے جا گائے جا

(۲۴-۱-۱۹۳۸)

فانی جگ

دنیا کی ہر شے ہے پیارے فانی، فانی، فانی
حسن بھی فانی، عشق بھی فانی، فانی مست جوانی
فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

الفت دل کا جذبہ، جذبہ سپنا، سپنا سایہ
سایہ دھوکا، دھوکا دنیا، دنیا رام کہانی
فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

پیاسے رہ گئے کلیوں اور پھولوں کے پیاسے ہونٹ
آیا جھونکا اور چلی گھنگھور گھٹا مستانی
فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

تپتی ریتوں کو جو سمجھے چشموں کی جھاکاری
آخر کو شعلوں پہ لوٹے وہ مورکھ سیلانی
فانی جگ کی سب جگمگ ہے جانی، آنی، فانی

(۲۴-۲-۱۹۳۸)

عورت

تو پریم مندر کی پاک دیوی تو حسن کی مملکت کی رانی
حیاتِ انساں کی قسمتوں پر تری نگاہوں کی حکمرانی
جہانِ اُلفت تری قلمرو حریم دل تیری راجدھانی

بہار فطرت ترے لب لعل گوں کی دوشیزہ مسکراہٹ
نظام کونین تیری آنکھوں کے سرخ ڈوروں کی تھرتھراہٹ
فروغِ صد کائنات تیری جبین سیمیں کی ضو فشانی

بجز کتے سینوں میں بس رہی ہیں قرار بن کر تری ادائیں
ترستی روحوں کو جامِ عشرت پلا رہی ہیں تری وفائیں
رگ جہاں میں تھرک رہی ہے شراب بن کر تری جوانی

دماغِ پروردگار میں جو ازل کے دن سے مچل رہا تھا
زبانِ تخلیق دہر سے بھی نہ جس کا اظہار ہو سکا تھا
نمود تیری اسی مقدس حسیں تخیل کی ترجمانی

ہے وادیٔ نیل پر ترا ابرِ زلف سایہ کناں ابھی تک
ہیں جامِ ایراں کی مے میں تیرے لبوں کی شیرینیاں ابھی تک
فسانہ گو ہے تری ابھی تک حدیث یوناں کی خوں چکانی

ہے تیری اُلفت کے راگ پر موجِ رودِ گنگا کو وجد اب تک
تری محبت کی آگ میں جل رہا ہے صحرائے نجد اب تک
جمالِ زہرہ ترے ملائک فریب جلووں کی اک نشانی

تری نگاہوں کے سحر سے گل فشاں ہے شعر و ادب کی دنیا
ترے تبسم کے کیف سے ہے یہ غم کی دنیا طرب کی دنیا
ترے لبوں کی مٹھاس سے شکریں ہے زہرابِ زندگانی

ترا تبسم کلی کلی میں ترا ترنم چمن چمن میں
رموزِ ہستی کے پیچ و خم تیرے گیسوؤں کی شکن شکن میں
کتابِ تاریخِ زندگی کے ورق ورق پر تری کہانی

جو تو نہ ہوتی تو یوں درخشندہ شمعِ بزمِ جہاں نہ ہوتی
وجودِ ارض و سما نہ ہوتا نمودِ کون و مکاں نہ ہوتی
بشر کی محدودیت کی خاطر ترستی عالم کی بیکرانی

(۳۱-۳-۳۸)

نفیرِ عمل

آہ کب تک گلۂ شومیٔ تقدیر کریں   کب تلک ماتمِ ناکامیٔ تدبیر کریں
کب تلک شیونِ جورِ فلکِ پیر کریں   کب تلک شکوۂ بے مہریٔ ایام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

آج برباد خزاں ہے چمنستانِ وطن   آج محروم تجلی ہے شبستانِ وطن
مرکزِ نالہ و شیون ہے دبستانِ وطن   وقت ہے چارۂ دردِ دلِ ناکام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

آؤ اجڑی ہوئی بستی کو پھر آباد کریں   آؤ جکڑی ہوئی روحوں کو پھر آزاد کریں
آؤ کچھ پیرویٔ مسلکِ فرہاد کریں   یہ نہیں شرطِ وفا بیٹھ کے آرام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

ایک ہنگامہ سا ہے آج جہاں میں برپا   آج بھائی ہے سگے بھائی کے خوں کا پیاسا
آج ڈھونڈے سے نہیں ملتی زمانے میں وفا   آؤ اس جنسِ گرانمایہ کو پھر عام کریں
نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

جامِ جم سے نہ ڈریں شوکتِ کَے سے نہ ڈریں حشمتِ روم سے اور صولتِ رَے سے نہ ڈریں
ہم جواں ہیں تو یہاں کی کسی شے سے نہ ڈریں ہم جواں ہیں تو نہ کچھ خدشۂ آلام کریں

نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

رشتۂ مکر و ریا توڑ بھی دیں، توڑ بھی دیں کاسۂ حرص و ہوا پھوڑ بھی دیں، پھوڑ بھی دیں
اپنی یہ طرفہ ادا چھوڑ بھی دیں، چھوڑ بھی دیں آؤ کچھ کام کریں، کام کریں، کام کریں

نوجوانانِ وطن ! آؤ کوئی کام کریں

(۸-۵-۱۹۳۸)

ابرِ صبوح

تیرتے بادل خنک جھونکے خمار آگیں سماں　　آسماں پر ناچتی اُڑتی ابابیلوں کے راگ
اس طرح لہرا رہی ہیں اودی اودی بدلیاں　　جیسے اِک کافر ادا کے دوش پر زلفوں کے ناگ
جیسے نیلی جھیل میں بہتی ہوئی اِک اوڑھنی
بھول آئی ہو جسے معصوم پنہارن کوئی
گدرے گدرے ابر پاروں کی چھلکتی چھاگلیں　　اس طرح ٹپکا رہی ہیں رس بھری مدرا کا جھاگ
جس طرح رو دے کوئی مہجور پی کی یاد میں　　سونپ کر جذبات کی اندھیاریوں کو دل کی باگ
جیسے سیمیں انگلیوں سے مُغبچہ ہائے بہشت
چھانتے ہوں حور کے گیسو میں صہبائے بہشت
وہ اُٹھی کالی گھٹا اُٹھ بھی مری مست شباب　　وہ اُڑا جاتا ہے بادل ہاں اُڑا بوتل کا جھاگ
بجھ چلا ہے روح کا آتش کدہ لا بھی شراب　　پھونک دے میرے رگ و پے میں کوئی بہتی ہی آگ
تجھ کو جامِ مے کے ان ہنستے شراروں کی قسم
ان ہواؤں کی قسم ان ابر پاروں کی قسم

(۱۱-۶-۱۹۳۸)

سرِ بام!

لو آ گئی وہ سرِ بام مسکراتی ہوئی — لیے اُچٹتی نگاہوں میں اک پیامِ خموش
یہ دھندلی دھندلی فضاؤں میں انعکاسِ شفق — یہ سونا رستہ، یہ تنہا گلی، یہ شامِ خموش
گلی کے موڑ پہ اک گھر کی مختصر دیوار — بچھا ہے جس پہ دھندلکوں کا ایک دامِ خموش
یہ چھت کسی کے سلیپر کی چاپ سے واقف — کسی کے گیتوں سے آباد یہ مقامِ خموش
کسی کے ہونٹوں کے اعجاز سے یہ چاروں طرف — تبسموں کے ضیا پاروں کا خرامِ خموش
کسی کے مدبھرے نینوں سے یہ برستا خمار — کسی کی نقرئی بانہوں کا یہ سلامِ خموش
منڈیر پر بصد انداز کہنیاں ٹیکے — کھڑی ہوئی ہے کوئی شوخ لالہ فامِ خموش
لیے اُچٹتی نگاہوں میں اک پیامِ خموش

(۱۸-۶-۱۹۳۸)

قیدی

سخت زنجیریں ہیں قیدی ! سخت زنجیریں ہیں یہ
ان کو ڈھالا ہے جہنم کی دہکتی آگ میں
انکی کڑیاں موت کے پھنکارتے ناگوں کے پیچ
انکی لڑیاں زندگی کی اُلجھنوں کے سلسلے
انکی گیرائی کے آگے تیری تدبیریں ہیں یہ
تیری تدبیریں؟ عبث سب تیری تدبیریں ہیں یہ
سخت زنجیریں ہیں قیدی' سخت زنجیریں ہیں یہ

بیڑیاں' قیدی ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں
دیکھ پاپی! اپنے سر پر تیز سنگینوں کی چھت
چار سُو لوہے کی سیخوں کی فصیل بیکراں
تو ادھر بے دست و پا بے حس و حرکت بے سکت
اور ادھر اس سوچ میں ہیں تیرے ظالم پاسباں
دکھ کی کالی کوٹھڑی سے تو کہیں بھاگے نہیں
بیڑیاں' قیدی ! ترے پاؤں میں ہیں تاگے نہیں

(۲۹-۹-۱۹۳۸)

کون؟

زمانے پہ چھاتی ہیں جب کالی راتیں — مرے دل سے کون آ کے کرتا ہے باتیں؟
چمکتے ہیں جب جھلملاتے ستارے — مرے من میں کیوں کوندتے ہیں شرارے؟
اُٹھاتی ہے جب کہکشاں چندر گاگر — اُبلتا ہے کیوں میرے اشکوں کا ساگر؟
گزرتے ہیں جب بادلوں کے سفینے — دھڑک اُٹھتے ہیں کیوں اُمیدوں کے سینے؟
کلی جب ہے شبنم کے جُھومر سے بجتی — مری روح میں کس کی بنسی ہے بجتی؟
گلستاں میں جب پھول کھلتے ہیں ہر سُو — مجھے کس کی زُلفوں کی آتی ہے خوشبو؟
یہ کیا بھید ہے کوئی بے نام ہستی — ہے آباد جس سے مرے من کی بستی
ہر اک لحظہ اک خوشنما روپ دھارے — مری روح سے کر رہی ہے اشارے

میں اس شکلِ موہوم کو ڈھونڈتا ہوں
میں اس سرِ مکتوم کو ڈھونڈتا ہوں

(۱-۱۱-۱۹۳۸)

صبحِ نو

اے دوست! ہو نوید کہ پت جھڑ کی رُت گئی   چٹکی ہے میرے باغ میں پہلی نئی کلی
پھر جاگ اٹھی ہیں راگنیاں آبشار کی   پھر جھومتی ہیں تازگیاں سبزہ زار کی

پھر بس رہا ہے اِک نیا عالم خمار کا
پھر آ رہا ہے لوٹ کے موسم بہار کا

اے دوست! اس سے بڑھ کے نہیں کچھ بھی میرے پاس   یہ پہلا پھول بھیج رہا ہوں میں تیرے پاس
کومل سا، مسکراتا ہوا، مشکبار پھول   پروردگارِ عشق کا یہ بے زباں رُسول
آتا ہے اک پیام رسانی کے واسطے   بسرے دنوں کی یاد دہانی کے واسطے
اے دوست ایک پھول کی نکہت ہے زندگی   اے دوست ایک سانس کی مہلت ہے زندگی
وہ دیکھ پَو پھٹی، کٹی رات اضطراب کی   اُچھلی خطِ اُفق سے صراحی شراب کی

آ! آ یہ صبحِ نو ہے غنیمت، مرے حبیب!
آیا ہے پھر بہار کا موسم! زہے نصیب!

(۹-۱۲-۱۹۳۸)

ریل کا سفر

کراچی کو جاتی ہوئی ڈاک گاڑی
دھوئیں کے سمندر میں تیراک گاڑی

مسافت کو یوں طے کیے جا رہی ہے
سفر کو غٹا غٹ پیے جا رہی ہے

یہ چٹیل سے میداں یہ ریتوں کے ٹیلے
ہیں جن پر بچھے دوب کے زرد تیلے

یہ کپاس کی کھیتیوں کی بہاریں
یہ ڈوڈوں کو چٹختی ہوئی گلعذاریں

گھنے بن کی پھلواڑیوں کی تگ و دو
اور ان پر بگولوں کی زُلفوں کے پرَتو

یہ چھوٹی سی بستی، یہ ہل اور یہ ہالی
یہ صحرا میں آوارہ، بھیڑوں کے پالی

یہ حیران بچے یہ خاموش مائیں
یہ گوبر کی چھینٹوں سے لتھڑی قبائیں

یہ نہروں میں بہتا ہوا مست پانی
یہ گنوں کی رت کی سنہری جوانی

یہ اینٹوں کا آوا، یہ اُونٹوں کی ڈاریں
یہ کیکر کے پیڑوں کی لمبی قطاریں

درختوں کے سایوں سے آباد رستے
یہ آزاد راہی، یہ آزاد رستے

بدلتے چلے جا رہے ہیں نظارے
نئے سے نئے آ رہے ہیں نظارے

یہ صحرا جو نظروں کو برما رہا ہے
مرے ساتھ بھاگا چلا آ رہا ہے

نظر ایک منظر پہ جمتی نہیں ہے
یہ موج آ کے ساحل پہ تھمتی نہیں ہے

یہ سچ ہے

یہ سچ ہے اس کی دُنیا میں کوئی قیمت نہیں ہوتی
پڑا رہتا ہے جب تک بحر کی آغوش میں موتی
یہ سچ ہے پھول جب تک شاخ سے توڑا نہیں جاتا
کسی کے گیسوئے پُر پیچ میں جوڑا نہیں جاتا
شراب ناب جب تک بٹ نہیں جاتی کٹوروں میں
چھلک سکتی نہیں ان مد بھری آنکھوں کے ڈوروں میں
یہ سچ ہے جب ندی اپنی روانی چھوڑ دیتی ہے
تو اس کے ساز کے تاروں کو فطرت توڑ دیتی ہے
یہ سچ ہے اپنے جوہر کھو رہا ہوں دیس میں رہ کر
گزرتی زندگی کو رو رہا ہوں دیس میں رہ کر

انقلاب

مری آنکھوں میں برستے ہوئے آنسو نہ رہے　　دل کی دُنیا نہ رہی ' درد کے پہلو نہ رہے

آہوں سے روح کی اگنی کی بھبھک جاتی رہی　　خشک ہونٹوں سے شرابوں کی مہک جاتی رہی

نیند کا چین گیا جاگنے کی بات گئی　　نشوں کا دن گیا اور مستیوں کی رات گئی

ذرّوں کے سینوں میں مہتابوں کی دُنیا نہ رہی　　قرمزی رنگوں میں گم خوابوں کی دُنیا نہ رہی

ڈال رکھا تھا تخیل نے جو رنگیں پردا　　رُخ ہستی سے ہے اُٹھنے لگا رفتہ رفتہ

اب حقیقت مری آنکھوں کے قریب آتی ہے　　نظر اب دُنیا کی تصویر مہیب آتی ہے

اب تبسم مجھے غنچوں کا رُلا دیتا ہے　　دل کے شعلوں کا ہر اک جھونکا ہوا دیتا ہے

حسن کے ناز و ادا جانتا ہوں جانتا ہوں　　اس کا سحر اس کا فسوں مانتا ہوں مانتا ہوں

چاند کی قاش سے ماتھے کی صباحت! سچ ہے　　پھول کی طرح حسین چہرے کی رنگت! سچ ہے

مست نظروں میں شرابوں کی ملاوٹ! سچ ہے　　سرخ ہونٹوں میں نباتوں کی گھلاوٹ! سچ ہے

دیکھتی ہیں مگر اب میری نگاہیں کچھ اور!　　اب مرے فکر پہ ہیں کھل گئیں راہیں کچھ اور

اب ہر اک شے کی حقیقت پہ گماں رکھتا ہوں　　اپنی تخییل کے قدموں پہ جہاں رکھتا ہوں

دیکھتا ہوں کہ نہیں کچھ بھی یہاں میرے بغیر　　خس وخاشاک کا ہے ڈھیر جہاں میرے بغیر

حسن اک دھوکا ہے اور عشق ہی خود بھول ہے اک
تتلی کیوں گل پہ گرے تتلی ہی خود پھول ہے اک

(۱-۱-۱۹۳۹)

یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

یہ باغ تیرا ہے یہ پھول تیرے ہیں چن لے
گلوں کے ریشوں سے دام حسین کوئی بن لے
ابھی بچھا نہ اسے، ایک التجا سن لے
مرے بغیر اُجڑ جائے گا ٹھکانہ مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

یہ سچ ہے، تیرے چمن سے چرایا ہے میں نے
یہ ایک تنکا یہیں سے اُٹھایا ہے میں نے
کہ جس پہ اپنا بسیرا بسایا ہے میں نے
ترے چمن میں تھا حق اس قدر بھی کیا نہ مرا؟
یہیں پہ رہنے دے صیاد آشیانہ مرا

یہیں پہ بیٹھ کے میں چپکے چپکے رولوں گا
کلی کلی مجھے چھیڑے گی، میں نہ بولوں گا
نہ گاؤں گا، میں زباں تک نہ اپنی کھولوں گا
تری فضاؤں پہ گر بار ہے ترانہ مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

تجھے ہے یاد؟ یہاں ایک پنچھی رہتا تھا
وہ جس کے نغموں کی رو میں زمانہ بہتا تھا
یہاں سے جانے لگا وہ تو رو کے کہتا تھا
"رفیق! جاتا ہوں! پھر جانے کب ہو آنا مرا
ترے سپرد یہ چھوٹا سا آشیانہ مرا"

اندھیرے میں کوئی پتا جو سرسراتا ہے
تو اب بھی راتوں کو دل میرا چونک جاتا ہے
سمجھتا ہوں وہ مرا ہم سرود آتا ہے
ہے جس کی ایک امانت یہ آشیانہ مرا
یہ ٹوٹی ٹہنی پہ برباد سا ٹھکانہ مرا

کبھی تو آئے گا وہ مژدۂ امید لیے
اک اور جنت گلپوش کی کلید لیے
اک اور گلشن آزاد کی نوید لیے

بلا کے نام باندازِ محرمانہ مرا
وہ آ کے سر پہ اٹھا لے گا آشیانہ مرا

وہ دیکھ! شاخیں ہلی ہیں — وہ آ رہا ہو گا
حسین کلیاں کھلی ہیں — وہ آ رہا ہو گا
رُتیں رُتوں سے ملی ہیں — وہ آ رہا ہو گا

یہیں، ادھر ہی، وہ سکھ سنگتی پرانا مرا
یہیں پہ رہنے دے صیاد، آشیانہ مرا

(۱-۲-۱۹۳۹)

بیساکھ

بیساکھ آیا، آئی فسوں زائیوں کی رُت
آئی حسین کلیوں کی برنائیوں کی رُت!
گاؤں کے مرد و زن نے اُٹھائیں درانتیاں
آئی سنہری کھیتیوں کی لائیوں کی رُت
گندم کی فصل کاٹنے کے خوشگوار دن
محنت کشوں کی زمزمہ پیرائیوں کی رُت
خوشوں کے بکھرے بکھرے سے انباروں کا سماں
کھلواڑوں کے نگاروں کی رعنائیوں کی رُت
کھیتوں میں دھیمے قہقہوں کا موسم حسیں
رستوں پہ گونجتی ہوئی شہنائیوں کی رُت
دہقان کی اُمید کی بار آوری کا وقت
دُنیا کے سوئے بخت کی انگڑائیوں کی رُت

(۲۲-۴-۱۹۳۹)

غزل

یہ دنیا ہے اے قلبِ مضطر سنبھل جا
یہاں ہر قدم پر ہے ٹھوکر سنبھل جا

بڑے شوق سے پی مگر پی کے مت گر
ہتھیلی پہ ہے تیری ساغر سنبھل جا

جہاں حق کی قسمت ہے سولی کا تختہ
یہاں جھوٹ ہے زیبِ منبر سنبھل جا

قیامت کہاں کی، جزا کیا، سزا کیا
ہے ہر سانس اِک تازہ محشر سنبھل جا

وہ طوفاں نے پُرخوف جبڑوں کو کھولا
وہ بدلے ہواؤں کے تیور سنبھل جا

نہیں اس خرابات میں اذنِ لغزش
یہ دنیا ہے اے قلبِ مضطر سنبھل جا

(۱۹۳۹-۴-۳۰)

قیصریت

ایک قطرہ سلطنت کی موج کا
اک سپاہی بادشہ کی فوج کا!

دوش پر تیر و کماں باندھے ہوئے
جا رہا تھا رخت جاں باندھے ہوئے

چوم کر اس کے گلابی گال کو
جاتے دم کہتا تھا اپنے لال کو

"دیکھتی ہے راستہ امی تری
جاؤ بیٹا! جاؤ! میں آیا ابھی"

بچہ مڑ کر چل پڑا اماں کی طرف
اور سپاہی خونی میداں کی طرف

وہ سپاہی جنگ میں مارا گیا
ڈوب اسکی زیست کا تارا گیا

لاش اسکی جوئے خوں میں بہہ گئی
کشتوں کے پشتوں میں کھو کر رہ گئی

لٹ گیا جب اس کی دلہن کا سہاگ
تھام لی شیطان نے اسکے دل کی باگ

اس نے کر لی ایک اور شادی کہیں
حسن اور خوئے وفا؟ ممکن نہیں

اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم
آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دو نیم

بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس
لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس

اسکے ننگے تن پہ کوڑے مار کر
پہرے داروں نے کہا دھتکار کر

کیا ترے مرنے کی باری آ گئی
دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی

وہ مُڑا چکرایا اور اوندھا گرا
گھوڑوں کے ٹاپوں تلے روندا گیا

دی رعایا نے صدا ہر سمت سے
''بادشاہِ مہرباں ! زندہ رہے''

(۲۳-۶-۱۹۳۹)

قیدی دوست

میرے قیدی دوست! تو مغموم سا رہتا ہے کیوں؟
لگ کے زنداں کی سلاخوں سے کھڑا رہتا ہے کیوں؟
رات دن پتھرائی آنکھوں سے مجھے تکتا ہے تو
بات وہ کیا ہے جو مجھ سے کہہ نہیں سکتا ہے تو
تیرے سینے کی نوائے راز کو سنتا ہوں میں
جب تری زنجیر کی آواز کو سنتا ہوں میں
لیکن اے ساتھی نہ گھبرا' مژدہ ہو' کل رات کو
سنتری دہرا رہے تھے راز کی اس بات کو
''حکم آیا ہے کہ اس زنداں میں ہیں جتنے اسیر
جن کے دکھیارے دلوں میں ہیں کھٹکتے غم کے تیر
ایک آہن پوش کشتی پر انھیں کر کے سوار
بھیج دو اس بحر کے پُرخوف طوفانوں کے پار''
دیکھ! اُفق پر صبح کی دھندلاہٹوں کے درمیاں
وہ نظر آیا سفینے کا سنہری بادباں!

اب ہماری قید گہ کے قفل کھولے جائیں گے
اس سفینے پر ہر ایک بد بخت کو لے جائیں گے
اُس جگہ اِک دُوسرے کے متصل بیٹھیں گے ہم
چند گھڑیوں کے لئے آپس میں مل بیٹھیں گے ہم
اپنی اپنی داستاں رو رو کے کہہ جائیں گے ہم
چند لمحوں کے لئے نشوں میں بہ جائیں گے ہم
بیڑیوں پر تیری رکھ کے اپنی سیمائے نیاز
میں پڑھوں گا میرے قیدی دوست! اُلفت کی نماز
اتنے میں کشتی کنارے سے لپٹ جائے گی دوست
اور مرے سجدوں کی عمر شوق کٹ جائے گی دوست
پھر قدم رکھتے ہی ساحل پر جدا ہو جائیں گے
از سر نو قیدیِ دامِ بلا ہو جائیں گے

(۲۴-۶-۱۹۳۹)

بیسویں صدی کے خدا سے

انہیں آنکھوں سے میں نے رب اکبر تیری دنیا میں
غرور حسن کو برباد و رسوا ہوتے دیکھا ہے
زر و دولت کی بے حس مورتی کے پاؤں پر میں نے
حسیں فاقہ کشوں کی لڑکیوں کو روتے دیکھا ہے
چمکتی دھوپ میں مزدور دوشیزہ کو رستوں پر
کڑکتے کوڑوں کی چھاؤں میں اینٹیں ڈھوتے دیکھا ہے
جوانی کی مہکتی رت میں بیواؤں کی آنکھوں کو
جگر کے زخم نمکیں آنسوؤں سے دھوتے دیکھا ہے
تری جنت پہ مجھ کو کیوں یقیں آئے کہ دنیا میں
گل اندامو ں کو میں نے خار و خس پر سوتے دیکھا ہے
وہ جن پر تو نے برسائے ہیں اپنی بخششوں کے پھول
انہی کو میں نے ہر رستے پہ کانٹے بوتے دیکھا ہے
تری آنکھیں نہیں لیکن سنا ہے دیکھتا ہے تو
ذرا دیکھ اپنے بندوں کی نظر سے گر رہا ہے تو

(۸-۷-۱۹۳۹)

بھکشا

پھرتا پھرتا دکھ کی وادی میں کھویا کھویا سا   لے کر اپنے اُجڑے دل کا ٹوٹا پھوٹا کاسا

آ پہنچا ہے تیرے در پر یہ دکھیا بھکیاری   سینے میں طوفان تمنا آنکھ سے آنسو جاری

تیرے اونچے ایواں کی یہ کنگریاں چمکیلی   چوم رہی ہیں جن کو سورج کی کرنیں البیلی

مرمر کی محرابوں کے نیچے وہ بند دریچے   جیسے بیٹھے ہوں جنت کے غلماں آنکھیں میچے

بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہکا جالی دار جھروکا   جس کی چلمن پر ہر ہلتا سایہ رنگیں دھوکا

تیرے دوارے پر آ کر میں اوگن ہار بھکاری   آنکھوں کے رستے ٹپکا کر سینے کی چنگاری

ذروں کو آج اشکوں کی برساتیں بانٹ رہا ہوں   خاکِ در پر سجدوں کی سوغاتیں بانٹ رہا ہوں

دیکھ لیا اب ڈوبتی ڈوبتی نبضیں کھاتی ہیں ہچکولے   روح کا پنچھی دل کی مٹی پر ہے کندے تولے

خاک میں مل جانے کو ہے اک چندر روپ جوانی
جیون کی بھکشا دے دے او راج محل کی رانی

(۲۴-۷-۱۹۳۹)

گر اس جہان میں جینا ہے

نہ تاجِ سر کو تو بیچ اور نہ تو سریر کو بیچ
گر اس جہان میں جینا ہے تو ضمیر کو بیچ
حیا کو اپنی نگاہوں سے حکمِ رخصت دے
زباں کو زہر ملے شہد کی حلاوت دے
فریب سجدہ سے اپنی جبیں کو واقف کر
ریا کے آنسوؤں سے آستیں کو واقف کر
ہے تیرے دل میں جو چنگاری اس کا نام نہ لے
خودی کا رُتبہٗ خودداری! اس کا نام نہ لے

(۱۹۳۹ء)

گھٹا سے

گھٹا! نہ رو! مرے دردوں پہ اشکبار نہ ہو
مجھ ایسے سوختہ ساماں کی غمگسار نہ ہو

لپیٹ لے یہ خنک چادریں ہواؤں کی
کسے طلب ہے تری مست کار چھاؤں کی

تو اپنے ساتھ ہی لے چل یہاں سے جاتے ہوئے
کھلونے اپنی پھواروں کے جھنجھناتے ہوئے

یہ بوندیوں کی نوائیں تجھے مبارک ہوں
یہ بہکی بہکی فضائیں تجھے مبارک ہوں

یہ نزہتیں مری محفل سے اے گھٹا لے جا
یہ اپنی بجلیوں کے ارغنوں اُٹھا لے جا

میں سن چکا ہوں بہت تیری داستانیں، بس
خموش! مجھ کو نہیں راس تیرے نغموں کا رس!

نہ چھیڑ آج یہ اپنی رسیلی شہنائی!
ہے مشکلوں سے مرے آنسوؤں کو نیند آئی!

(۱-۲-۱۹۴۰)

بیاہی ہوئی سہیلی کا خط

کیا یہ سچ ہے مری سہیلی کہ تم
جلد ہی اب بیاہی جاؤ گی
اک نئی زندگی میں اُترو گی
اک نئی قیدگہ بساؤ گی
آج تک جن سے تم بچھڑ نہ سکیں
ان کو اس طرح چھوڑ جاؤ گی
ایک گھونگھٹ کی اوٹ میں چھپ کر
زیست کی قید کاٹ جاؤ گی
نقرئی بندھنوں میں جکڑی ہوئی
راہِ ہستی پہ ڈگمگاؤ گی
پھر بھی آئیں گی چاندنی راتیں
تم مگر یوں نہ گنگناؤ گی
آنکھ میں ہوں گے سرمہ آلود اشک
آہ! تم پھر بھی مسکراؤ گی
آندھیوں کی زدوں میں آئی ہوئی
شمع کی طرح بجھتی جاؤ گی
آہ! یہ دُکھ بھرا نظامِ حیات
جس کے پنجے میں تلملاؤ گی
آہ! یہ طوق رسم و راہِ جہاں
جس کو زیب گلو بناؤ گی
جس میں جلتا ہے دل سہاگن کا
اس جہنم میں ہنستی جاؤ گی

مان لوں کیا یہ میں کہ آج کی رات آخری گیت اپنا گاؤ گی
پانی بھرنے کے اِک بہانے سے اپنی گاگر اُٹھا کے آؤ گی
آ کے ندی کنارے لہروں کو دیر سے منتظر سا پاؤ گی
ایک لمحے کے بعد کیا ہوگا ان کی گودی میں تھرتھراؤ گی
زندگانی کے قید خانے کی ساری زنجیریں کاٹ جاؤ گی

کاش پہنچے یہی نوید مجھے
مِلے اس خط کی یوں رسید مجھے

(۱۷-۲-۱۹۴۰)

کہاں؟

موت کی گفتگو نہ کر اے دوست
آہ یہ آرزو نہ کر، اے دوست

جب تک سانس کی روانی ہے
تیرے جیون کی رُت سہانی ہے

جب تک دل کے داغ روشن ہیں
شش جہت میں چراغ روشن ہیں

دوست! جب تک ترا حریم نگاہ
دے رہا ہے تجلیوں کو پناہ

زندگی جام ہے محبت کا
زندگی نام ہے محبت کا!

ہم نشیں، کس قدر قریب ہیں ہم
زندگی ہے تو خوش نصیب ہیں ہم

دل سے دل کی طرب نوازی ہے
روح سے روح محوِ بازی ہے

آنکھیں آنکھوں میں مے انڈیلتی ہیں
انگلیاں گیسوؤں سے کھیلتی ہیں

شانے سے شانہ بھڑ رہا ہے یہاں
نغمے سے نغمہ چھڑ رہا ہے یہاں

جو بھی ارمانِ دلِ حیات میں ہے
آج تو دامِ ممکنات میں ہے

کل نہ معلوم کیا سے کیا ہو جائے
کل کا مفہوم کیا سے کیا ہو جائے

اُلجھے اُلجھے اجل کے دھارے سے
جا کے ٹکرائیں کس کنارے سے

کس نشیمن میں، کس ٹھکانے، کہاں —؟
اپنی منزل ہو پھر نہ جانے کہاں —؟

(۱۵-۳-۱۹۴۰)

عقدۂ ہستی

(ریل کے ایک سفر کے زبانی تاثرات)

خشک ندی کے کنارے، ریل کی پٹڑی کے پاس
کھل رہا ہے دشت میں اک لالہ آتش لباس
اس طرف کملائی دوب اور اس طرف سُوکھا ببول
پل رہا ہے جن کی بے احساس گودی میں یہ پھول
کھیلتا ہے گرچہ انگاروں سے اس کا ہر نفس
مٹ رہا ہے خاروخس میں ہم نشینِ خاروخس
درد کی فطرت کا دم اس طرح گھٹتا دیکھ کر
دیکھ کر اس سوز کی دولت کو لٹتا دیکھ کر
مجھ کو نظم زیست کی بربادیاں یاد آگئیں
میری آنکھوں میں برستی بدلیاں لہرا گئیں
اس پر اک ساتھی نے حیرت سے کہا "کیوں کیا ہوا
او مسافر بھائی تو کیوں رو پڑا؟ کیوں، کیا ہُوا؟"

ایسے لمحے میں حقیقت کو چھپانے کے لئے
دور کیوں جائے بھلا انساں بہانے کے لئے
مسکرا کر میں نے جھٹ اس سے کہا "کچھ بھی نہیں"
یونہی بیٹھے بیٹھے آنکھیں میری دھندلا سی گئیں"
عقدۂ ہستی کو سلجھایا ہے کس نے اور کب؟
آہ اس دنیا میں دل روتے ہیں اور ہنستے ہیں لب!

مسافر

گزرگاہِ جہاں پر— ہم مسافر!
شکستہ دل، شکستہ دم، مسافر
عجب کچھ زندگانی کا سفر ہے
مسافر کا نہیں محرم مسافر
گلے ملتی ہے رو رو کر گلوں سے
کہ اس گلشن میں ہے شبنم مسافر
کٹھن ہے عشق کی منزل کٹھن ہے
چلے ہیں اس روش پر کم مسافر
ابد اک موڑ تیرے راستے کا
تو سیلِ شوق ہے، مت تھم مسافر!
گلہ کیوں شوئیِ قسمت کا امجدؔ؟
کرے کیوں فکرِ بیش و کم مسافر

(۲۷-۱۰-۱۹۴۰)

سازِ فقیرانہ

گلوں کی سیج ہے کیا، مخملیں بچھونا کیا
نہ مل کے خاک میں گر خاک ہوں تو سونا کیا
فقیر ہیں وہ فقیرانہ ساز رکھتے ہیں
ہمارا ہنسنا ہے کیا اور ہمارا رونا کیا
ہمیں زمانے کی ان بیکرانیوں سے کام!
زمانے بھر سے ہے کم دل کا ایک کونا کیا
نظامِ دہر کو تیورا کے کس لئے دیکھیں
جو خود ہی ڈوب رہا ہو اُسے ڈبونا کیا
بساطِ سیل پہ قصرِ حباب کی تعمیر
یہ زندگی ہے تو پھر ہونا کیا، نہ ہونا کیا
نہ رو کہ ہیں ترے ہی اشک ماہ و مہر امجدؔ
جہاں کو رکھنا ہے تاریک اگر تو رونا کیا

(۳-۱۲-۱۹۴۰)

سفرِ حیات

ہر اک نقشِ پا کی زباں پر فسانے
ہر اک ڈوب میں مضطرب سو ترانے
ہر اک موڑ پہ اس کے لاکھوں زمانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا' نہ جانے ؟

کسی بوستانِ حسیں کے کنارے ؟
کسی وادیٔ شبنمیں کے دوارے ؟
کسی خارزار حزیں کے ٹھکانے ؟
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا' نہ جانے ؟

اُمیدوں پہ حسرت سی برسا رہے ہیں
پس و پیش سے کان میں آ رہے ہیں
بھٹکتے ہُوئے قافلوں کے ترانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا' نہ جانے ؟

ہر اک گام کی زد میں خاموش لاشیں
جبینوں کے ٹکڑے تو سینوں کی قاشیں
یہ گزرے ہوئے رہرووں کے "فسانے"
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے؟

مسافر رواں ہیں ادھر آنکھ میچے
ادھر تنکے تنکے کی چلمن کے نیچے
بچھا رکھا ہے دام اپنا قضا نے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے؟

نگاہوں کے آگے اجل کی سیاہی
کرے کیا بچارا تھکا ہارا راہی
چلا تو ہے تقدیر کو آزمانے
یہ رستہ کہاں ختم ہوگا، نہ جانے؟

(۱۹۴۰ء)

چچی

آگ لینے آئی جب کوئی پڑوسن شام کو
یوں چچی نے وا کیا اپنے لبِ دشنام کو

"اس موئی پاپن نے تو مجھ کو جلا ڈالا بہن!
کوئی ہو اس بے حیا سے پوچھنے والا' بہن

یہ نگوڑی کیوں گلی کے موڑ پر کل پچھلی رات
کر رہی تھی جانے کیا سرگوشیاں اور اسکے سات"

وہ بچاری آلوؤں کو چھیلتی بے اختیار
ہاتھ میں اپنے چبھو بیٹھی چھری کی تیز دھار

صبح کو گونجی فضا میں جب کسی بنسی کی لے
اسکے سینے میں تڑپ اُٹھی کوئی بیتاب شے

ہاتھ سے چلتی ہوئی چکی کا دستہ چھٹ گیا
اِک جہاں اسکے تصور میں بسا اور لُٹ گیا

اتنے میں ظالم چچی کی غیظ ناک آواز پر
جھک گئی پھر سے وہ سنگِ آسیا کے ساز پر

کیوں نہ ہو اس دُکھ کی ماری کیلئے جینا وبال
اک چچی کے ہاتھ میں ہو جسکے گھر کی دیکھ بھال

باپ جس کا کارخانے میں کہیں مزدور ہو
اپنی اکلوتی جواں بیٹی سے کوسوں دُور ہو

جس کی ماں پھر لوٹ کر فردوس سے آئی نہ ہو
وہ ابھاگن! جس بچاری کا کوئی بھائی نہ ہو

(۱۹۴۰ء)

ملاقات

تم کو شہروں نے پکارا، سبزہ زاروں نے مجھے — تم کو پھولوں نے صدا دی اور خاروں نے مجھے
میں انہی پگڈنڈیوں پر بانسری چھیڑا کیا — بے ارادہ، جانے کس کا، راستہ دیکھا کیا
جب ندی پر ترمراتا شام کی مہندی کا رنگ — میرے دل میں کانپ اٹھتی کوئی ان بوجھی اُمنگ
جب کھلنڈری ہرنیوں کی ڈار بن میں ناچتی — کوئی بے نام آرزو سی میرے من میں ناچتی
ریت کے ٹیلے پہ سرکنڈوں کی لہراتی قطار — نیم شب میں اور میری بانسری اور انتظار
آہ یہ سرسبز میداں، دم بخود، لامنتہی — جن کی وسعت میں جوانی میری آوارہ رہی
بعد مدت کے تمھارا آج ادھر آنا ہُوا — وہ زمانہ بچپنے کا 'آہ' افسانہ ہُوا
کتنے سلجھے بال، کیسی نرم و نازک آستیں — ہنس رہے ہو؟ اِک تمھارا قہقہہ بدلا نہیں
مجھ کو دیکھو میں ابھی وابستۂ آغاز ہوں — ان حسیں ویرانیوں میں گوش برآواز ہوں
دوڑتی جاتی ہے دُنیا وقت کے محمل کے سات — میرے حصے میں وہی بیتاب دن، بےخواب رات
ڈھونڈتا ہوں گم ہوئی ہے میری دُنیائے حسیں — ہاں، انہی پھیلے بیابانوں کے پچھم میں کہیں!

ایک دن جب میرے مرنے کی خبر پائے گی وہ
میری تربت پر تو آئے گی، ضرور آئے گی وہ

(۱۹۴۱ء)

راجا پرجا

راجے کا کل آج !
سارا جہاں محتاج
سکھ، دھن، باج، خراج
گدی، مسند، تاج
تیس برس کا راج
اور پھر اس کے بعد
اک روضہ ویراں

پرجا کا آج نہ کل
شاخ نہ پھول، نہ پھل
بھٹکے دل کا دَل
بھوکا، پیاسا، شل
لاکھ برس کا پل
اور پھر اس کے بعد
مٹتے گورستاں

راجا، پرجا کہاں ؟
اک بہتا طوفاں
کوہ عظیم و گراں
کاہ سبک ساماں
جھونپڑیاں، ایواں
نغمہ اور فغاں
ہر شے اس میں رواں
ہر شے اس میں نہاں
اور پھر اس کے بعد
ایک وہی طوفاں

(۱۹-۱۲-۱۹۴۲)

کون؟

چاندی کی پازیب کے بجتے گھنگھروؤں سے کھیلے
ریشم کی رنگیں لنگی کی سُرخ البیلی ڈوری
نازک نازک پاؤں برقعے کو ٹھکراتے جائیں
چھم چھم بجتی جائے پائل' ناچتی جائے ڈوری !
ہائے سنہری تلے کی گلکاری والی چپلی
جس سے جھانکے مست سہاگن مہندی چوری چوری
جانے کتنی سندر ہوگی روپ نگر کی رانی
اُف چپلی میں سکڑی سکڑی انگلیاں گوری گوری
جھونکوں کی خوشبو' ذرّوں میں نور لٹاتی جائے
مجھ بھاگوں کے مارے کی قسمت کوری کی کوری !

(۲۰-۱۲-۱۹۴۲)

صبح و شام

تجھ کو خبر ہے کتنی صبحیں
کتنی صبحیں بن گئیں شامیں
آرزوؤں سے مہکی صبحیں
بن کے پرانی پیامی شامیں
ڈوب رہی ہیں ڈوب چکی ہیں
وقت کے طوفانی دریا میں
کتنی صبحیں کتنی شامیں

اب بھی رواں ہے ناؤ میری
اب بھی رواں ہے دھیرے دھیرے
دُور ہے اُمیدوں کا کنارا
دُور ہیں اَرمانوں کے جزیرے
دُور، اُفق سے دُور، وہ دُنیا
جس کی فضا میں جھومیں جھامیں
نوریں صبحیں، رنگیں شامیں

ان صبحوں کو ان شاموں کو
کون مری دُنیا میں لائے
ہائے میری دُکھیا دنیا
جس کے اُجالے بھی ہیں سائے
وہ سائے جن کی ظلمت کو
سونپ چکی ہیں اپنی اگا میں
میری صبحیں میری شامیں

غزل

کیا گریباں چاکِ صبح اور کیا پریشاں زلفِ شام
وقت کی لامنتہی زنجیر کی کڑیاں تمام

دیکھیے تنکے کی ناؤ کب کنارے جا لگے
موج ہے دہشت خروش اور سیل ہے وحشت خرام

شمع کے دامن میں شعلہ، شمع کے قدموں میں راکھ
اور ہو جاتا ہے ہر منزل پہ پروانے کا نام

زیست کی صہبا کی رو تھمتی نہیں، تھمتی نہیں!
ٹوٹتے رہتے ہیں نشّے، چھوٹتے رہتے ہیں جام

(۱۹۴۳ء)

ارتھی

تو نے کیا دیکھا؟ تو نے کیا سمجھا؟
جب تری زندگی نواز آنکھیں
گوشۂ بام کی بلندی سے
فرطِ حیرت سے، دردمندی سے
جھک پڑیں اُس ہجومِ گریاں پر
جو گزرتا تھا تیرے کوچے سے
ایک ارتھی اُٹھائے شانوں پر

چند سہمے سے پھول اور اک چادر
زندگی کی بہار کا انجام؟
بحرِ ہستی کی آخری منجدھار؟
تیرے حسن اور مرے جنوں کا مآل؟
اپنا احساس تھا کہ میرا خیال؟
میں نے دیکھا تو سوگواری تھی
تو نے کیا سوچا؟ تو نے کیا سمجھا؟

حسینؓ

وہ شام، صبحِ دو عالم تھی جب بہ سرحدِ شام
رُکا تھا آ کے ترا قافلۂ ترے خیّام !
متاعِ کون و مکاں، تجھ شہید کا سجدہ
زمینِ کرب و بلا کے نمازیوں کے امام
یہ نکتہ تو نے بتایا جہان والوں کو !
کہ ہے فرات کے ساحل سے سلسبیل اک گام
سوارِ مرکبِ دوشِ رسولؐ — پورِ بتولؓ
چراغِ محفلِ ایماں ترا مقدس نام !

(۱۳-۱-۱۹۴۳)

ہزاروں راستے ہیں

ہزاروں راستے ہیں منزلیں ہیں
سمندر اور صحرا بھی ہیں حائل
مگر رہبر ستارے کی شعاعیں
ہیں ہر رہرو کے سینے کی متاعیں
ہر اک کشتی سمجھتی ہے کہ تارا
رواں ہے ساتھ اس کے بن کے رہبر

تمھاری رہ مری منزل الگ ہے
تمھارے دل سے میرا دل الگ ہے
سمندر اور صحرا ان میں حائل
کسے معلوم ہے یہ دو مسافر
کبھی اک دوسرے سے مل سکیں گے
کبھی شاید یہ غنچے کھل سکیں گے!

مگر دونوں کا رہبر ہے وہ تارا
جو اِک دن میرے حرفِ آرزو پر
تمھاری انکھڑیوں سے گر پڑا تھا
جبینِ وقت پر تاباں ہُوا تھا

شب و روز آئے اس کے بعد لاکھوں
ابھی تک اس کی کرنوں کے اشارے
صدا بھٹکے ہوؤں کو دے رہے ہیں
ہماری کشتیوں کو کھے رہے ہیں
ہمارے راستے کتنے الگ ہوں
ہماری منزلیں کتنی جُدا ہوں
مگر رہبر ستارا تو وہی ہے
امیدوں کا کنارا تو وہی ہے

(۱۸-۱-۱۹۴۳)

نعتیہ مثنوی

شہر مکہ بتوں کی بستی ہے — چار سو تیرگی برستی ہے
لو وہ اِک نور کی کرن پھوٹی — بزمِ آفاق جگمگا اُٹھی
دیکھنا اک یتیم بے ساماں — بے نوا، کم سخن، تہی داماں
جس نے یوں سال و سن گزارے ہیں — بھوک میں اپنے دن گزارے ہیں
پیرہن تن پہ تارتار اس کا — کوئی محرم نہ دوستدار اس کا
تپتی ریتوں پہ محوِ خواب کہیں — تیز کانٹوں سے زخم یاب کہیں
چلتی تیغوں کے درمیان کبھی — کنکروں سے لہولہان کبھی
ذرہ ذرہ عدوئے جاں اس کا — تشنۂ خوں ہے اِک جہاں اس کا
ہاں مگر لب جب اُسکے ہلتے ہیں — دل کے مرجھائے پھول کھلتے ہیں
جب وہ پیغامِ حق سناتا ہے — وجد میں دوجہاں کو لاتا ہے
جب وہ اُونچی صدا سے کہتا ہے — بادیانہ ادا سے کہتا ہے
گمرہو! تم یہ کیا سمجھتے ہو — پتھروں کو خدا سمجھتے ہو
دل دہلتے ہیں قہرمانوں کے — دیئے بجھتے ہیں کفرخانوں کے
بات یہ کیا زبان سے نکلی — لاکھ تلوار میان سے نکلی
ظالموں کی اذیتیں اِک سمت — اور خدا کی مشیتیں اِک سمت

دیکھنا تیز دھوپ کی لو میں   آندھیوں کی شرارہ گوں رہ میں
مکے سے دور اور مدینے کے پاس   جا رہا ہے کوئی بہشت انفاس
جا رہا ہے وہ کوئی راہ نورد   دو جہاں اسکی پاک پلکوں کی گرد
سانڈنی پر سوار جاتا ہے   درمیانِ غبار جاتا ہے
ساتھ اک صدقِ جاں روانہ ہے   عشق کا کارواں روانہ ہے
سرِ مکہ کچھ اور منظر ہے   مرتضیٰؓ ہے نبیؐ کا بستر ہے
شب ہے اندھیرا گہرا گہرا ہے   چار سو قاتلوں کا پہرا ہے
وہ پیمبر کی چارپائی پر   ہنستا ہے بے سمجھ خدائی پر

سوئے یثرب نبیؐ کی باگ اٹھی   کفر کے خرمنوں سے آگ اٹھی
روئے صحرا کے ٹیلے ٹیلے پر   آج قدغن ہے ہر قبیلے پر
اس طرف سے رسولؐ اگر گزرے   تو وہ کٹوا کے اپنا سر گزرے
آہ وہ راستہ بیاباں کا   خطِ نوری جبینِ ایماں کا
اس کی پاکیزہ خاک کیا کہنا !   خاک اور تابناک کیا کہنا !
جس کے ذروں کو رشک ماہ تمام   کر گیا ناقۂ نبیؐ کا خرام
نقشِ پا دے کے جس کے سینے کو   میرا آقاؐ گیا مدینے کو
کاش وہ خاک مجھ کو مل جائے   سرمۂ پاک مجھ کو مل جائے

میں اسے رکھ کر آنکھ کے تل میں   آنکھ کے تل میں، دیدۂ دل میں
جگمگاتا پھروں زمانے میں   زندگی کے سیاہ خانے میں

جو نبیؐ کے قریب ہیں وہ لوگ   کس قدر خوش نصیب ہیں وہ لوگ
اسکے قدموں کے ساتھ رہتے ہیں   اس کی موجوں کے ساتھ بہتے ہیں
اسکے ابرو کے ہر اشارے پر   تیرتے ہیں لہو کے دھارے پر
اسکی عزت پہ سر کٹاتے ہیں   آخری وقت مسکراتے ہیں
اسکے قدموں میں دولتِ کونین   انکا ایک ایک سانس بدر و حنین
ہاں وہ دیکھو بلالؓ کی حالت   چور زخموں سے خون میں لت پت
گرم ریتی پہ تلملاتا ہے   تازیانوں کی چوٹ کھاتا ہے
موت کا خوف ہے نہ زیست کی فکر   اس کے ہونٹوں پہ لا الٰہ کا ذکر

دیکھنا جنگ اُحد کی جاری ہے   وقت اسلامیوں پہ بھاری ہے
چارسو کافروں کا ریلا ہے   ابن سکّن زیادؓ اکیلا ہے
اُس نے دیکھا کہ چند پیکرِ شر   وار کرنے کو ہیں محمدؐ پر
دوڑ کر آکے درمیانِ نبیؐ   جان دے کر بچائی جانِ نبیؐ
لاش اس کی اُٹھا کے لاتے ہیں   سامنے مصطفیٰؐ کے لاتے ہیں

ابھی کچھ اس میں ہوش باقی ہے
اک نفس کا خروش باقی ہے
دم آخر کے وقتِ مشکل میں
ابھی کچھ آرزو سی ہے دل میں
اپنے سینے کے بل گھسٹتا ہے
پائے محبوب ؐ سے چمٹتا ہے
اُن کے قدموں کو چوم لیتا ہے
مسکراتا ہے جان دیتا ہے
آہ یہ رُتبۂ فدائے نبی ؐ
آخری سانس اور یہ پائے نبی ؐ
آہ یہ شمعِ حق کے پروانے
دُرجِ انسانیت کے دُردانے
کیا محبت ہے کیا ارادت ہے
موت اُن کیلئے عبادت ہے

جنگِ موتہ کا اِک سماں دیکھو
زیدؓ کے ہاتھ میں نشاں دیکھو
زیدؓ وہ اک غلام پاک نہاد
جس کو اسلام نے کیا آزاد
جب نبی ؐ کی اسے غلامی ملی
دونوں عالم میں شادکامی ملی
ہر گھڑی راحتوں میں صدموں میں
ہے وہ شاہِ عرب کے قدموں میں
یہ ہے رنگِ اُخوت اسلام
آج سردارِ فوج ہے وہ غلام
وہ جری تیس سو سپاہ کے ساتھ
لڑتا ہے فوجِ بے پناہ کے ساتھ
ہو محبت رسول ؐ سے جس کو
لائے خاطر میں وہ بھلا کس کو
اس کی ہمت کو کون ٹوک سکے
اس کے طوفاں کو کون روک سکے
ہیں رواں زندگی کے ہنگامے
تسمہ اس کی رکاب کا تھامے

جو کچھ اس محفل حیات میں ہے　　اسکی باگ اسکے پاک ہات میں ہے
موت اس کیلئے ہے شیریں جام　　آخری گھونٹ اور عمر دوام
آرہی ہے وہ فتحیاب سپاہ　　لاشِ زید شہیدؓ کے ہمراہ
میرِ لشکر نہیں ہے لشکر میں　　صفِ ماتم بچھی ہے گھر گھر میں
وہ گہراب نہیں خزینے میں　　ایک کہرام ہے مدینے میں
آب گوں دیدۂ پیمبر ﷺ ہے　　مرنے والے کا کیا مقدر ہے
اسکے زخموں کا خون چہرے کی دھول　　پارہی ہے نبی ﷺ کی آنکھ سے پھول
وہ عدم کی طرف روانہ ہے　　ساتھ یہ بے بہا خزانہ ہے
اس کی بچی کو دیکھ کر رنجور　　اسکے اشکوں کو چومتے ہیں حضور ﷺ
باپ کا صدمہ کیا پڑا اُس پر　　جھک پڑی رحمتِ خُدا اُس پر
رحمتِ دو جہاں کے سائے میں　　فرق کیا اپنے اور پرائے میں
جس کے سر پر نبی ﷺ کا سایہ ہے　　اسکی دُنیا ہے اس کی مایا ہے
اس کا جینا ہے اس کا مرنا ہے　　ڈوب کر بھی اُسے اُبھرنا ہے
ایک منزل ہے اس کے ایماں کی　　سربلندی مقام انساں کی
لو لگا کر خُدا کی ہستی سے　　آدمی کو اُٹھانا پستی سے
رُوح میں شورشیں زمانوں کی　　سانس میں کروٹیں جہانوں کی
دل میں سامان سو اُجالے کا　　ہاتھ میں پلو کملی والے کا

(۲۶-۳-۱۹۴۳)

زندانی

دردوں کے مارے دو قیدی !
زنجیروں کی چھنکاروں میں
اک غم گیں سا ، اک حیراں سی
کالی کالی کوٹھڑیوں میں
دونوں کی نظروں پر پہرے
ہونٹوں پر مہریں چسپاں سی
لاکھوں آرزوئیں ، اُمیدیں
دوزخ کے ناگوں کی صُورت
سینوں میں غلطاں غلطاں سی
سہمے سہمے سے قدموں کی
آہٹ کان میں آجاتی ہے
آہٹ ! مدھم سی ، بے جاں سی
تو اک چرخے کی گھوں گھوں میں
گُم سی ہو کر رہی جاتی ہے
خوف زدہ ، پُرمعنی کہانی
پھر وہی جلادوں کی نگاہیں
پھر وہی سنگینوں کی نوکیں
پھر وہی خنجر ، پھر وہی پھانسی

(۱۱-۵-۱۹۴۳)

ریڈنگ روم

میز پر اخبار کے پھیلے ورق
بکھرے بکھرے، تیرہ تیرہ، چاک چاک
ڈھل گئی ہے قالب الفاظ میں
سینۂ ہستی کی آہِ دردناک
پاس ہی دیوار کو ٹیکے ہوئے
ریڈیو گرمِ سخن ، محوِ بیاں
چیختی ہیں جامۂ آواز میں
خون کے چھینٹے ، لہو کی بوندیاں

شام ریڈنگ روم کی مغموم شام
چند کان ، اعلانچی کی بات پر
چند آنکھیں، سوچ میں ڈوبی ہوئیں
مرتکز ، اخبار کے صفحات پر
ایک کمرے میں سمٹ کر آگئے
کتنے دکھڑوں کے صدا پیکر حروف

کتنے دردوں کے مسطر زمزمے
کتنے اندھے گیانی، بہرے فیلسوف!

پھر بھی کچھ ادراک میں آتا نہیں
کیا ہے رقصِ گردشِ ایام، کیا!
اک شکستہ ناؤ اِک خونی بھنور
کیا ہے اس افسانے کا انجام، کیا؟
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں!

چھت کے نیچے، روزنوں کے درمیاں
گول گول آنکھوں کے اندر محوِ دید
کالے پارے کی مرقص پتلیاں

کاش یہ حیراں کبوتر جانتے
خفتہ ہے ان کاغذوں کی سطح پر
کتنے بھٹکتے آشیانوں کا دھواں
کتنے نخچیروں کی آہوں کے شرر
ہیں ان آوازوں کے اندر پرکشا

کتنے کرگس، جن کو مرداروں کی بو
کھینچ لائی ہے سرِ دیوار باغ !
چھت کے نیچے، مضطرب، نظارہ خو
فکر مند آنکھوں میں حیراں پتلیاں

یہ کبوتر، دیکھتے تھکتے نہیں
دیکھتے ہیں-سوچتے ہیں-کیا کریں-
یہ مفکر کچھ سمجھ سکتے نہیں !

(۱۰-۱-۱۹۴۴)

لاہور میں

ڈاک خانے کے ٹکٹ گھر پر خریداروں کی بھیڑ!
ایک چوبی طاقچے پر کچھ دواتیں ــــ اک قلم
یہ قلم میں نے اُٹھایا اور خط لکھنے لگا:-
"پیارے ماموں جی!
"دُعا کیجیے ــــ خدا ــــ رکھ لے ــــ بھرم
"آج انٹرویو ہے! -کل تک فیصلہ ہو جائے گا
"دیکھیں کیا ہو؟ مجھ کو ڈر ہے ...."
اتنے میں تم آ گئیں!
" اک ذرا تکلیف فرما کر پتہ لکھ دیجیے"
میں نے تم سے وہ لفافہ لے لیا' جھجکا نہیں'
"بے دھڑک" لکھ ڈالا میں نے "کانپتے ہاتھوں" کیساتھ
مختصر رنگیں پتہ: "گلگت میں -گوہر خاں کے نام!"
"شکریہ"-"جی کیسا؟" -اک ہنستی نگہ زیرِ نقاب
ڈاک میں خط ــــ تانگہ ٹمپل روڈ کو ــــ قصہ تمام!

(۱۲-۳-۱۹۴۴)

غزل

آ، سازِ گلستاں کو بہ مضرابِ خار چھیڑ
مطرب، کوئی ترانہ بیادِ بہار چھیڑ

سوئے ہوئے سکوتِ چمن کو ذرا جگا،
کچھ تو — نواطرازِ غمِ روزگار — چھیڑ

کل یہ جگہ تھی وادیٔ نکہت، رباب اٹھا
کل یاں ہجومِ گل تھا، سرودِ بہار چھیڑ

قصہ کوئی بہ ماتمِ جام و سبو سنا
نغمہ کوئی بہ تعزیتِ سبزہ زار چھیڑ

کچھ بھی نہ ہو، خزاں تو ہے، اِک راگنی الاپ
ہر خس ہے ایک سازِ نوا در کنار چھیڑ

شاید پلٹ کے آ نہ سکے اب بہار، گا
پژمردہ شاخسار پہ جھک کر ستار چھیڑ

(۱۹۴۴-۱۱-

قبلا خاں

ظانا دو میں قبلا خاں کے رنگ محل کے سائے
لرزیں اس دیوانی ندی پر جس کی مقدس موجیں
گہری اور اتھاہ دراڑوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسالیں اپنی بستی
دُور دُور تک سونا اگلتی دھرتی کا پھیلاؤ
جس کے چاروں اور فصیلیں، گنبد اور منارے
باغ ــــ جو ہنستی آب جُوؤں کی چنچلتا سے چمکیں
بوجھل بوجھل خوشبوؤں سے لدے پھندے اشجار
بوڑھے جنگل ــــ جیسے پرانے پہاڑوں کے ہمزاد
کہیں کہیں جن کی وسعت میں
دھوپ میں لپٹے سبزہ زار

اوہ! وہ دیکھو
گھنے گھنیرے پیڑوں کے اس پار
سبز چٹانوں کے سینوں میں گہرے بھیانک غار
ہیبت ناک مقام
رچی بسی پاکیزگیوں کا ایک فسونِ دوام

جیسے ڈھلتے چاند کی پیلی چھایا میں گھل جائیں
برہا کی اگنی میں جل مٹنے والی اک دیوداسی کی پرچھائیں
یہی وہ غار یہی وہ گھاؤ
جس کی تھاہ سے اچھلے کھولے
ایک ابلتے چشمے کی ان تھک آوازوں کا وہ الاؤ
جو دھرتی کی ہانپتی چھاتی میں بے کل سانسوں کی مانند
تڑپے اور تڑپتا جائے
جس سے جھم جھم برسیں
جلتی چٹانوں کے سیال انگارے
جیسے تپتے توے پر بھنتے دانوں کی کلپاہٹ
انہی اچھلتی چٹانوں کے جھرمٹ سے ابھر کر ڈوبے
وہی مقدس دریا جس کی موجیں
گہری اور اتھاہ دراڑوں کے سینوں کو ڈستی
گھور اندھیروں کے ساگر میں بسا لیں اپنی بستی
یہی ہے وہ ہنگامۂ صوتِ سنگ و فروش دریا
جس کے روپ میں قبلاِ خاں کے کانوں سے ٹکرائیں
گزرے بلوانوں کی صدائیں
جنگ کے نقارے کی دھم دھم

(۱۹۴۴ء؟)

ایک دُعا

(جسے درجۂ قبولیت نصیب ہوا)

خلاقِ دو جہاں! مری آنکھوں کو نور دے
چھینی ہوئی یہ دولتِ کیف و سرور دے
پھر قوتِ نظارۂ دشت و دیار بخش!
پھر طاقتِ مشاہدۂ نزد و دُور دے
مجھ پر نگاہِ مہرِ "سمیع" "بصیر" کر
مجھ کو نویدِ لطفِ خدائے غفور دے
اللہ! مجھ کو دیدۂ بینندہ کر عطا
مولا! تو ہی دوائے دلِ ناصبور دے
پھر سونپ میری آنکھوں کو آنکھوں کی روشنی
یہ میری چیز پھر مجھے دے اور ضرور دے

(۲۲-۱۲-۱۹۴۶)

غزل

ضمیر رازداں ہے اور، میں ہوں
جہاں اندر جہاں ہے اور میں ہوں

درِ پیرِ مغاں ہے اور میں ہوں
وہی رطلِ گراں ہے اور میں ہوں

وہی دورِ زماں ہے اور میں ہوں
وہی رسمِ فغاں ہے اور میں ہوں

فریبِ رنگ و بو ہے اور تم ہو
بہارِ صد خزاں ہے اور میں ہوں

جہاں ہے — اور سکوت نیم شب ہے
مرا قلبِ تپاں ہے اور میں ہوں

یہ دو ساتھی نہ جانے کب بچھڑ جائیں
مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں

(۲-۲-۱۹۵۰)

غزل

چمن چمن میں یہ طغیانِ رنگ لالہ پھرو
ختن ختن میں یہ انبوہِ صد غزالہ پھرو

سجا کے ہونٹوں پہ اک جشنِ زہر خند چلو
چھپا کے سینے میں صد موجِ آہ و نالہ پھرو

روش روش پہ بچھی ہے سیاہیوں کی بساط
پلک پلک پہ جلا کر چراغِ لالہ پھرو

چکید اشکِ فراواں سے ہے کشید شراب
جہانِ قیصر و جم میں تہی پیالہ پھرو

کنارِ دل سے گزرتی اُداس راہوں پر
ہر ایک سانس ہے عمر ہزار سالہ پھرو

(۱۹۵۰ء)

مشرق و مغرب

نہ خوابِ مشرق
نہ سحرِ مغرب
بس اِک چھلکتی گداز مٹی
کی چادرِ سبز، جس کے دامن
میں کل تھے انبانِ گندم و جو
اور آج انبارِ سیم و آہن

یہ کون سمجھے
یہ کون جانے
کہ اس تڑپتے ہوئے زمانے
کے سائے میں ڈولتی سی شمعوں
کی روشنی، جو پیالہ گل
صراحی سنگ، کوزۂ مس
کو پھاند کر، شہر و دشت و ساحل
سے اُٹھتے گرز و سنانِ و خنجر

پہ جم گئی تھی — وہ کانپتی لَو
جو آج بھی طاقِ زندگی پر
سلگ رہی ہے، اسی کا پرتو
جہانِ نو کے فروغِ منزل
میں ڈھل گیا ہے
عجیب قصہ ہے ضربِ خارا
سے ذہنِ فولاد جل اُٹھا ہے

نہ کوئی مشرق
نہ کوئی مغرب
مگر وہ اک زینۂ مراتب
جو اَن گنت، بے زباں غلاموں
کی ٹوٹتی پسلیوں، پہ، کل بھی،
ہزار کف در دہاں خداؤں
کے بوجھ سے کپکپا رہا تھا
اور آج بھی اک وہی ترازو
کہ جس میں زنجیر پوش روحوں
کے شعلہ اندام دست و بازو

بہ مُژدۂ یک اشک ' تل رہے ہیں
اگر یہی تھا نصیبِ دوراں
یہ نالۂ غم ' یہ اک مسلسل
خروشِ انبوہِ پابجولاں
ازل کی سرحد سے نسلِ آدم
کی یہ کراہیں ' جو روز و شب کے
عمیق سناٹے سے پیہم
اُبھر رہی ہیں ' یہ چشم و لب کے
فسانہ ہائے سرشک و شیون
اگر مقدر یہی تھا اپنا
تو یہ مقدر یقین جانو اٹل نہیں تھا

یہی ہے مشرق
یہی ہے مغرب

وہ پارہ ہائے سفال و خارا
وہ عقلِ حیراں کی کارگاہیں
وہ جنسِ نایاب ' کل ہمارے
جہانِ صد ریزۂ خزف میں

ہماری دولت تھے، ہم خدا تھے
اور آج بھی یہ شرار پیکر
حقیقتوں کے طلسم سوزاں
یہ وسعت بحر و بر میں غلطاں
ضمیر آہن کی جلتی سانسیں
یہ ذرّے ذرّے کے قلب پیچاں
میں کھولتی قوتوں کے طوفاں
زمانہ ہے جن کی رو میں تنکا
جو آج بھی ہو وجود اِن کا
ہماری مٹھی میں، ہم خدا ہیں
سیاہیوں کے چھلکتے خُم سے
اُبھرتی کرنوں کا حوصلہ ہیں

(۱۲-۳-۱۹۵۱)

ایک شام

ندی کے لرزتے ہوئے پانیوں پر
تھرکتی ہوئی شوخ کرنوں نے چنگاریاں گھول دی ہیں
تھکی دھوپ نے آ کے لہروں کی پھیلی ہوئی ننگی باہوں پہ اپنی لٹیں کھول دی ہیں!

یہ جوئے رواں ہے
کہ بہتے ہوئے پھول ہیں جن کی خوشبوئیں گیتوں کی سسکاریاں ہیں
یہ پگھلے ہوئے زرد تانبے کی چادر پہ اُلجھی ہوئی سلوٹیں ہیں
کہ زنجیر ہائے رواں ہیں!

بس اک شورِ طوفاں!
کنارا نہ ساحل!
نگاہوں کی حد تک
سلاسل! سلاسِل!
کہ جن کو اٹھائے ہوئے ڈولتی پنکھڑیوں کے سفینے بہے جا رہے ہیں
بہے جا رہے ہیں
کہیں دُور ان گھور اندھیروں میں جو فاصلوں کی ردائیں لپیٹے کھڑے ہیں
جہاں پر اَبد کا کنارا ہے — اور اِک وہ گاؤں:
وہ گنے کے کیاروں پہ آتی ہوئی ڈاک گاڑی کے بھورے دھوئیں کی چھچھلتی سی چھاؤں!

(۱۲-۱۹۵۱)

منزل

اس ایک بات سے انکار ہو نہیں سکتا
کہ ہم نے اپنے لہو سے، بساطِ عالم پر
لکیر کھینچی ہے جس سلطنت کی، اس کا وجود
ہے ایشیا کے شبستاں میں، صبحِ نو کی نمود!

یہ سب بجا ہے، کہ ہم جن جگر کے ٹکڑوں کو
بہ شہر وقریہ، بہ دشت وچمن، بہ کوچہ وبام
بھڑکتی آگ میں بہتے لہو میں چھوڑ آئے
وہ روحیں، جن کے سیہ پوش، ماتمی سائے
ہمارے ہنستے ہوئے پیکروں سے لپٹے ہیں
وہ قافلے، کہ جنھیں مہلت سفر نہ ملی
انھی کے سڑتے ہوئے لوتھڑوں کی ہونکتی بو
انھی کی ڈوبتی فریادیں، چیختے آنسو
ہمارے محلوں کے نغمے، ہمارے باغوں کے پھول!

مگر یہ پھول' یہ نغمے' یہ نکہتوں کے ہجوم
سحر سحر کو اگر مشکبار کر نہ سکے
نفس نفس کو امینِ بہار کر نہ سکے
وہ جن کے واسطے یہ گلستاں سجایا گیا
گر اس طرح تہی داماں' تہی سبد ہی رہے
تو سوچ لو کہ یہ نازک' لطیف پرتوِ نور
یہ لڑکھڑاتی ہواؤں میں ٹھہرا ٹھہرا غرور
ہزار ساعتِ بے برگ کے بیاباں میں
یہ اک امنگوں بھری سانس!

اس کا مستقبل؟
ہماری زندگیوں سے اِک اِک تڑپ لے کر
پروئے ہیں جو فلک نے' بہ سلکِ شام و سحر
گلوئے غم کے لئے' چہرۂ طرب کے لئے
سدا بہار ارادوں کے ہار

ان کا مآل؟

یہی سوال ہے رازِ غمِ زمان و زمیں!
حضور! ان کا جبینِ پرشکن جواب نہیں

(۱۲-۱۹۵۱)

دُھوپ چھاؤں

ناچتی ندیاں

جُھومتے جھامتے پیڑ

اُجیالی دھوپ

ان سے بھی آگے، دُور کہیں وہ دُنیا

جس کا رُوپ

آنے والے مست دنوں کے ہونٹوں پر مُسکان!

سمے کا دھیان!

پھیکی پھیکی چاندنیاں

اور کجلی کجلی دھوپ

جن کی اُڑتی راکھ میں جھلکے بیتے دنوں کا رُوپ

سناٹوں کی گھمر گھمر میں ڈوبتا ڈوبتا گیت

سمے سمے کی ریت

من کی یہ چنچل لہریں، ان کا کوئی نہ ٹھور مقام
دن گزرے تو صبح سویرا، رات کٹے تو شام
ساون ساون، جلتے جھونکے
پلک پلک، برسات
سمے سمے کی بات

(۱۲-۱۹۵۱)

اکھیاں کیوں مسکائیں

کون بتائے رُوپ نگر کی سکھیاں اکھیاں کیوں مسکائیں،
دل کے راگ محل کی تانیں،
سندیسوں کے دیس سے ہو کے
پائل کی جھنکار کو روکے
جب ہونٹوں کے دروازوں پر چھپ چھپ آئیں رُک رُک جائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

چھاند کے سناٹوں کے جزیرے
مہر بلب سانسوں کے بیاباں
آن بسیں جب رقصاں رقصاں
اِک لمحے کے رین بسیرے میں ارمانوں کی پرچھائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

گھونگھٹ کھولے، نہ منہ سے بولے
من کی بانی، چنچل رانی،
جب یہ کہانی، ڈورانجانی
دنیاؤں سے گزرے بن کر دھیمی بانسریوں کی صدائیں
اکھیاں کیوں مسکائیں

(۸-۱۲-۱۹۵۲)

ایک خیال

تمھارے ہونٹ وہ گھلتے سے ریزہ ہائے نبات
مرے لبوں سے ملے، جھکتی جھکتی پلکوں کے سات
تو جھونکے جھونکے میں لہرا گئی شمیمِ حیات

کسے خبر، کہ پھسلتا ہوا وہ جسمِ حسیں
مری بھنچی ہوئی باہوں کی دولتِ رنگیں
اب اس کی خاک بھی خاکِ لحد میں ہے کہ نہیں

تمھاری گردِ کفن اور ہجومِ کرمکِ گور
مصاحبانِ اجل، گنگ و پابریدہ و کور
بس ایک میری نوا میں، تمھاری روح کا شور

میں زندہ ہوں تو مری زندگی تمھاری حیات
وگرنہ یوں تو ہے کس کو دوام، کس کو ثبات
نفس نفس، سرِ ظلمات، پرتوِ ظلمات

(۸-۶-۱۹۵۳)

جیون دیس

مجھے یقیں تھا
میں جانتا تھا
کہ اس اندھیرے گھنیرے جنگل میں جس کے شانوں
پہ تیرتے بادلوں کے سائے — سیاہ گیسو
بکھر گئے ہیں، ضرور کرنوں لدے جہانوں
کا کوئی پرتو، ڈھلی ڈھلی دھوپ کا تبسم
کہیں درختوں کے مخملیں سبز سائبانوں
سے چھن کے اس نغمہ رو ندی پر جھلک اُٹھے گا
جو آنکھ اوجھل مسرتوں کے حسین ٹھکانوں
کی اوٹ سے پھوٹتے اُجالوں میں بہہ رہی ہے
مرے خیالوں میں بہہ رہی ہے!

یہ کون جانے
یہ کون سمجھے
کہ جب بھی اس گھومتی زمیں پر کسی سہانے
سمے کی دھن میں اٹھی ہیں ترسی ہوئی نگاہیں
تو ذرّے ذرّے میں زندگی کے نگار خانے
کی جگمگاتی ہوئی سگندھیں سما گئی ہیں
ابد کی خاموشیوں میں ڈوبے ہوئے ترانے
ندی کے سینے سے موج بن کر گزر گئے ہیں
مرے خیالوں میں بھر گئے ہیں

(۱۹۵۳ء)

نہ کوئی سلطنتِ غم ہے نہ اقلیم طرب

کیا کہوں، کتنے غموں، کتنے غموں کی شکن آلود بساط
وقت کے گھومتے زینوں پہ مرے رُکتے ہوئے قدموں کے سات
کس طرح بچھتی لپٹتی ہی چلی آئی ہے
کیا بتاؤں یہ کہانی بڑی طولانی ہے

یہ مرا قصہ غم کون سنے ؟ کس کو سناؤں — کس کو
اپنے احساس کا وہ جلتا ہوا زہر پلاؤں — جس کو
پیتے پیتے مری اک عمر کٹی ہے اک عمر
دیکھتے ہو وہ جو اک جادۂ نورانی ہے

وہ جو اک موڑ ہے اور وہ جو جھروکا ہے سر بام بلند
کبھی پہنچی نہیں جس تک سحر و شام کے سایوں کی کمند
وہ جو جھکتی ہوئی مڑتی ہوئی دیواریں ہیں
جن کا منصب انہی گلیوں کی نگہبانی ہے

وہ جو ہر شام انہی گلیوں میں کوئی مست سی لے
بند ہوتے ہوئے دروازوں کے آہنگ میں گھل جاتی ہے
وہ خموشی، سفرِ شب کے تسلسل کی نقیب
جس کی میت پہ اندھیروں نے ردا تانی ہے
میں نے اک عمر اسی معمورۂ ظلمات میں رقصاں، جولاں
ہر قدم اپنے ہی قدموں کی صداؤں سے گریزاں، لرزاں
ہر جام سے چھلکے ہوئے نشوں میں مگن
خاک ان راہوں کی یوں خاک بہ سر چھانی ہے
جس طرح ایک سہارے کی تمنا میں کسی ٹوٹتے تارے کی حیات
مہ و انجم کے سفینوں کی طرف اپنے بڑھائے ہوئے ہات
خم افلاک سے ٹکرا کے بھسم ہو جائے
(ان خلاؤں میں کسے تابِ پرافشانی ہے!)

میں بھی پلکوں پہ امنگوں کے دیے لے کے گرجتے ہوئے طوفانوں میں
منتظر تھا کہ اچانک کہیں باغوں میں، بیابانوں میں
آ کے بس جائے کسی نغمہ شیریں کی بہار!
یہ مرے گرد جو پھیلی ہوئی ویرانی ہے

اب یہاں ریزۂ صد ساغرِ بشکستہ سے کلیاں پھوٹیں
میں نہیں کہتا کہ کلیاں نہیں مہکیں مرے گلزاروں میں

مجھ کو یہ غم ہے وہ اک لمحۂ نایاب کہ جو
حاصل سلطنتِ عالم امکانی ہے
جب مری زیست سے ٹکرا کے بھسم ہو بھی گیا تب مجھے معلوم ہُوا
تب میں سمجھا، کہ یہ راہیں، یہ گھروندے، یہ پھبکتی دنیا
اب یہ سب کچھ غمِ جاوید کی اِک دھڑکن ہے
اب یہی زخم ہیں اور شغل نمکس رانی ہے

آج بھی جب کہیں رستے میں، کسی موڑ، کسی منزل پر
کسی دیوار سے کنکر بھی پھسل جاتا ہے
کوئی دامن کہ جسے نازِ گل افشانی ہے
دھوپ میں سوکھتی خرما کی چنگیروں سے بھرے کوٹھوں سے
ایک پل کے لئے اُڑتا ہے سمٹتا ہے تو دھیرے دھیرے
کوئی لے سی مرے احساس میں بھر جاتی ہے
تارِ بربط کی کوئی لرزش پنہانی ہے

جو شب و روز کے ایواں میں فغاں بن کے بکھر جاتی ہے
آسمانوں سے، زمینوں سے کسی دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے
کوئی چپکے سے مرے کان میں کہہ جاتا ہے
سنتے ہو، کس کی یہ آواز ہے، پہچانی ہے؟

"یوں کب تک صبح و شام جلیں
بے سُود جلیں ، ناکام جلیں
جب دنیا والے سو جائیں
میٹھے سپنوں میں کھو جائیں......
جب چلتے دریا تھم جائیں
تاروں کی نگاہیں جم جائیں
جب آگ بجھے چوپالوں کی
جب آنکھ لگے رکھوالوں کی
دیوار و در سے چمٹتے ہوئے
سائے کی طرح سمٹتے ہوئے
دو بھک منگوں کے بھیس میں ہم
جا نکلیں اک اور دیس میں ہم
کچھ دور، اُفق کے پار، اُدھر
ہے ایک نیا سنسار ، اِدھر
خوشیوں کی سنگاروں کی دُنیا
پھولوں کی بہاروں کی دُنیا"

آج اس فرصتِ یک گام کو روتا ہوں جب اک لغزش پا

چھین کر لے گئی مجھ سے وہ امنگوں سے چھلکتی دُنیا

آہ وہ دُنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
یوں تو آفاق میں دُنیاؤں کی ارزانی ہے
ان خلاؤں میں ستارے بھی ہیں، خورشید بھی ہے، ماہ بھی ہے
کون جانے کہ زمانے کے سمندر کی کوئی تھاہ بھی ہے
لیکن اک دنیا جسے کھو کے میں پھر پا نہ سکا
جس کے ماتم میں مری چاک گریبانی ہے
میری سم خوردہ تمناؤں کی نظروں سے گریزاں ہی رہی
لاکھ ڈھونڈھا، مگر افسوس کہ اک رنج پشیماں نگہی
بوجھ بن کر مری تقدیر کی پلکوں پہ رہا
اب مرا دل ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
اب یہ دُنیا، یہ صدا کوش نصیبوں سے بھرے شہر و دیار
غموں خوشیوں کے جھمیلوں میں نہاتی ہوئی روحوں کا نکھار
مجھ سے پوچھو تو مرے سامنے اب یہ دُنیا
ورقِ مصحفِ اندوہِ گراں جانی ہے

سوچتا ہوں یہی دو گھونٹ جو میں نے غمِ دوراں سے پیے
یہی دو سانس، شبستانِ ابد میں یہی دو بجھتے دیے ——
دوش و فردا کی فصیلوں میں یہی دو رخنے
یہی جو سلسلۂ زندگیِ فانی ہے

کیا اسی ساعتِ محرومیٔ غم تاب کی خاطر میں نے
وسعتِ وادیٔ ایام میں کانٹوں کے قدم چومے تھے ؟
لاکھوں دُنیاؤں کے لُٹتے ہوئے کھلیانوں سے
میرا حصہ یہی میری تہی دامانی ہے ؟

کیا اسی واسطے ماضی کے نخستانوں سے اِک موجِ حیات
اپنے ہمراہ لیے ناچتی گاتی ہوئی صدیوں کی برات
آ کے اس ساحلِ گل پوش سے ٹکرائی ہے؟
کیا یہی مقصدِ صد عالمِ امکانی ہے
کہ جب اس سطحِ خروشندہ پہ ڈھونڈھوں میں کوئی رنجتِ طرب
کوئی مکھ' کوئی نگہ' کوئی تبسم' کوئی جینے کا سبب
آسمانوں سے صدا آئے ''تو کیا ڈھونڈھتا ہے
تیرا ساماں تو یہی بے سروسامانی ہے''

عقل حیران ہے' یہ طرفہ حجاباتِ حریمِ اسرار
عقدہ راحت و غم' رازِ جہانِ گل و خار
پابہ زنجیر ارادوں کا خروش پیہم
یہی مستقبلِ معمورۂ انسانی ہے ؟
کس کی فتراک میں ہیں عرشِ بریں فرشِ زمیں؟ کون کہے
پسِ صد پردۂ افلاک کوئی ہے کہ نہیں ؟ کون کہے——

جانے کن گہرے دھندلکوں سے ضیا پاتی ہے
درحقیقت یہ حقیقت کی جو تابانی ہے
اتنے زخموں سے سجا کر دلِ بے تاب کی پژمردہ جبیں—
کس نے بھیجا ہمیں اس جلتے ہوئے دیس میں؟ معلوم نہیں!
یوں نہ اپنے دمِ امید کو بہلائے کوئی '
کون کہتا ہے گلستان میں بہار آئی ہے

جی میں آئی ہے کہ اک بارِ غمِ زیست پہ احساں دھر کر
دیگِ گردوں میں اُبلتے ہوئے زہراب سے اک خُم بھر کر
(دیگِ گردوں کہ ابد زنگ شکم میں جس کے
کھولتے دردوں کا ہنگامہ لافانی ہے)
اسی زہراب سے خُم بھر کے چھڑک دوں اُفقِ دوراں پر
آگ ہی آگ برسنے لگے اس پھولوں بھرے بستاں پر

اب یہی دھن ہے کہ اس ظلمتِ بے پایاں کو
جو مری روح کے ایوان کی زندانی ہے

اُٹھ کے پھیلا دوں انہی اُونچے درختوں سے ڈھکی راہوں پر
انہی گدرائی ہوئی دھوپ میں لہراتی چراگاہوں پر

اب ارادہ ہے کہ ان بس بھرے ارمانوں کو
جنکے سایوں میں مری زیست کی ویرانی ہے
گھول دوں جھومتے جھونکوں کے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
سینہ دشت پہ بجتی ہوئی شہنائیوں کی تانوں میں

چاہتا ہوں کہ یہ زیتون کے جنگل کا سکوت
جس کی وسعت ہے کہ اک عالمِ حیرانی ہے
میری کھوئی ہوئی دنیاؤں کے کہرام سے تھرا اُٹھے—

اب یہ ٹھانی ہے کہ جمتی ہوئی بوندوں کے یہ بکل چھینٹے
تیز جھالوں کے یہ چابک سے کہ جن کی زد پر
کبڑے رستوں کی تھکی پیٹھ کی عُریانی ہے
یہ دھواں دھوپ ترائی' یہ دھواں دھار پہاڑوں کی فصیل
دور تک چوٹیوں اور بدلیوں کے دیس کی سرحدِ جمیل
برف سی بدلیاں' جن کے لب تر سے پیوست
برف کی چوٹیوں کی دودھیا پیشانی ہے
ہاں یہ سب سلسلہ رنگ' یہ گہوارہ حسن و افسوں—
میں اسے اپنی دکھی روح کی ان راگنیوں سے بھر دوں

جن کی لہریں کبھی آنسو ہیں، کبھی آہیں ہیں
جن کی تقدیر کبھی آگ کبھی پانی ہے

کوئی غایت، کوئی منزل، کوئی حاصل سفرِ ہستی کا —
کوئی مقصود بلندی کا کہ مفہوم کوئی پستی کا ؟ —
کوئی مشعل بھی نہیں کوئی کرن بھی تو نہیں
شب اندھیری ہے گھٹا ٹوپ ہے، طوفانی ہے
بولو اے نغمہ سرایانِ تحیر کدہ کا بکشاں
میں کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں جاؤں، کہاں ؟

نغمہ کواکب

دائموس:

ناچ ناچ جھوم جھوم
گھوم گھوم گھوم گھوم

دیکھنا ادھر ضرور — اِک نظر
ناچتا ہے نزد و دُور — بے خبر
دامن نگارِ نور — تھام کر
کہکشاں کے موڑ پر — فاصلوں کا اک ہجوم
ناچ ناچ — گھوم گھوم

وسعت ابد پناہ — اِک ترنگ
عالمِ شب سیاہ — اِک امنگ
منزلیں، نشان راہ — سحرِ رنگ
شعلہ شعلہ انگ انگ — آگ آگ روم روم
گھوم گھوم — گھوم گھوم

بیوس:
دیے جلتے رہے دیے جلتے رہے
گھم گھم اُمڈے دھوئیں کے دَل
جگ جگ پھیل گئے کاجل
دم دم، دھم دھم، گرے محل
مٹتی ہوئی صدیوں میں پَل
ڈھلتے رہے
دیے جلتے رہے!

کتنے زمانے، کتنے سپن
توڑ گئے اپنے درپن
نیر بہاتے رہے نین

وقت کے جھکڑ گگن گگن

جلتے رہے

دیے جلتے رہے!

اندھیاروں کے زہر پیے

آنکھوں کو گل رنگ کیے

اَمر اُجالے لو میں لیے

جیون کی منڈلی میں دیے

جلتے رہے

دیے جلتے رہے!

اُرناؤس:

بھنور بھنور مری نوکا

کوئی ساحل ہے نہ کنارا

اِک پھیلتا بڑھتا دھارا

بہے نگر نگر مری نوکا، بھنور بھنور

ہر آن رُتوں کا میلہ

ہر سمت سمے کا ریلا

چلے گھمر گھمر مری نوکا، بھنور بھنور

بوجھا اتنے ہیں کڑیل جن کے
یہ دکھ سکھ ' بیتے تنکے
گریں اُبھر اُبھر مری نوکا ' بھنور بھنور
کہتی ہوئی من کی بانی
تقدیر جہاں کی رانی
پھرے سنور سنور مری نوکا ' بھنور بھنور

پلوطو:
کتنی اندھیری رات ہے چمکو
چمکو
شام وسحر کی اوٹ سے ہر دم
پیہم
گھور رہے ہیں طوفاں ہم کو'
چمکو!

دیکھو ' تیرگیوں کے فتنے '
کتنے
روند چلے عالم عالم کو
چمکو!

سُکھ میں سمو لو اِک اِک پل کو
جھلکو!
مَن میں بجھا لو شعلۂ غم کو
چمکو!

آتے ہوئے قرنوں کا تبسم
ہم تم
جگمگ دمکو، جھم جھم جھمکو
چمکو
کتنی اندھیری رات ہے چمکو
چمکو

کرۂ ارض:

نہ عکسِ خاک کہیں اور نہ رقصِ نور کہیں
نہ کوئی وادیِ ایمن نہ شمعِ طور کہیں
بجھی ہے راکھ میں غلطاں مئے طہور کہیں
پڑا ہے شیشۂ افلاک چور چور کہیں
خلاؤں کے جھنڈ میں لرزے ابد کی پینگ کوئی
نظر کے سامنے، حدِ نظر سے دور کہیں
مقدروں کے جہاں در جہاں اندھیروں میں

بھٹک نہ جائے مرا شوقِ ناصبور کہیں
یہ اضطرابِ مسلسل کی خوں چکاں گھڑیاں
ہے ان سے بڑھ کے کوئی دولت سرور کہیں
اگر ہمیں بھری دنیا میں مُسکرا نہ سکے
تو ڈول جائیں گے یہ سلسلے ضرور کہیں

شہر در شہر منادی ہے کہ "اے خندہ فروشانِ حیات!
ہر بجھی رُوح کے آنگن میں کھلا ہے چمن امکانات
نہ کوئی سلطنت غم ہے نہ اقلیم طرب
زندگی ہی فقط آئین جہاں بانی ہے!
جانے کس تیرہ اُفق سے یہ گھٹاؤں کے تھرکتے سائے
ماہتابوں کے چمکتے ہوئے سینوں سے نتھر کر آئے
ساتھ لے کر وہ خنک موج' خماریں جھونکے
جن کی زد میں مری تپتی ہوئی پیشانی ہے
اپنے سینے میں جگا کر انہی دردوں' انہی یادوں کے فسوں
پھر تمناؤں کے تصویر کدے میں نگراں بیٹھا ہوں
سامنے صفحۂ صد رنگِ رموزِ کونین
کانپتی انگلیوں میں موقلم مانی ہے!

(۲۰-۱۰-۱۹۵۴)

نرگس

میں نے حسرت بھری نظروں سے تجھے دیکھا ہے
جب تو روز اک نئے بہروپ میں، روز اِک نئے انداز کے سات
اپنی ان گاتی ہوئی انکھڑیوں کی چشمک طناز کے سات
روز اِک تازہ صنم خانۂ آہنگ میں در آئی ہے!

ایکٹریس! روپ کی رانی! تجھے معلوم نہیں،
کس طرح تیرے خیالوں کے بھنور میں جی کر
کن تمناؤں کا تلخابۂ نوشیں پی کر
میں نے اِک عمر ترے ناچتے سایوں کی پرستش کی ہے
تو نے اِک عظمتِ صد رنگ سے جس جذبے کو
آج تک اپنے لیے مژدہ ہزار اشک سمجھ رکھا ہے
وہ محبت مرے سینے میں تڑپتی ہوئی اِک دُنیا ہے
جو ترے قدموں کی ہر چاپ پہ چونک اُٹھتی ہے

کاش میں بھی وہی اِک عکسِ درخشاں ہوتا
دلِ انساں سے اُبھرتی ہوئی موہوم تمناؤں کا عکس
ایک مانگی ہوئی اچکن میں سمایا ہوا مامورِ فغاں شخص
جس کے پہلو میں تری روح دھڑک سکتی ہے

غزل

اِک وہ کہ جن کی فکر ہے ارض و سما شکار
اِک تو کہ ہے طلسمِ شب و روز کا شکار

لاؤ کہیں سے کوئی ضمیرِ فرشتہ صید'
ڈھونڈھو کہیں سے کوئی نگاہِ خدا شکار

اس انجمن میں دیکھیے اہل وفا کے ظرف
کوئی اداشناس ہے کوئی ادا شکار

آتا ہے خود ہی چوٹ پہ صیدِ سبک مراد
ہوتا ہے ورنہ کون ز کارِ قضا شکار

ظلِ ہما کی اوٹ میں چلّے پہ تیر رکھ
آساں نہیں نگاہ کے نخچیر کا شکار

جولاں گہِ حیات انہی کی ہے' دوستو
فتراک میں ہے جن کے دلِ مدعا شکار

غزل

نہیں سنتا کوئی مجھ کشتۂ آلام کے شکوے
کیے میں نے ہر اک ایواں کی چوکھٹ تھام کے شکوے

شفق کے رنگ آنکھوں میں، سحر کی اوس پلکوں پر
نہ آئے پھر بھی لب پر چرخِ نیلی فام کے شکوے

یہ کیسا دور ہے جس میں مجھے سننے پڑے ساقی
وبالِ ہوش کے طعنے، شکستِ جام کے شکوے

اب ان بھولے ہوئے قصوں کو دہرانے سے کیا حاصل
یہ اب کیا آپ لے بیٹھے دلِ ناکام کے شکوے

تماشا ہے کہ جن کے واسطے گردش میں تھے عالم
انھیں بھی سوجھتے ہیں گردشِ ایام کے شکوے

غزل

چاندنی میں سایہ ہائے کاخ و کو میں گھومیے
پھر کسی کو چاہنے کی آرزو میں گھومیے

شاید اک بھولی تمنا، مٹتے مٹتے جی اُٹھے
اور ابھی اس جلوہ زارِ رنگ و بو میں گھومیے

رُوح کے دربستہ سناٹوں کو لے کر اپنے ساتھ
ہمہماتی محفلوں کی ہاؤ ہو میں گھومیے

کیا خبر، کس موڑ پر مہجور یادیں آملیں
گھومتی راہوں پہ، گردِ آرزو میں گھومیے

زندگی کی راحتیں ملتی نہیں، ملتی نہیں
زندگی کا زہر پی کر جستجو میں گھومیے

کنجِ دوراں کو نئے اِک زاویے سے دیکھیے
جن خلاؤں میں نرالے چاند گھومیں گھومیے

بھکارن

تیز قدموں کی آہٹوں سے بھری
رہگزر کے دو رویہ سبزہ و کشت
چار سُو ہنستی رنگتوں کے بہشت

صد خیابانِ گل، کہ جن کی طرف
دیکھتا ہی نہیں کوئی راہی !
سُرخ پھولوں سے اِک لدی ٹہنی
آن کر بچھ گئی ہے رستے پر
کنکروں پر جبیں رگڑتی ہے
راہگیروں کے پاؤں پڑتی ہے

"میں کہاں روز روز آتی ہوں
ہے مرے کوچ کی گھڑی نزدیک،
جانے والو، بس اِک نگاہ کی بھیک"

موجودگی

پھر آج دل میں کوئی موجِ غم مچلتی ہے
شبِ خیال میں قندیلِ عود جلتی ہے
پھر اک ادائے حجاب
رسومِ دہر کی زنجیر اُتار آئی ہے
بہار آئی ہے

رسومِ دہر کی اس آتشیں فصیل کے پار
گداز سینوں کی مخمور دھڑکنوں کے دیار
محبتوں کے سراب
کہ جن کو تیر کے آتی ہے پائلوں کی جھنک
مرے دکھے دل تک!

ہر اک طرف ہوسِ دید کے نیستاں میں
کسی حسین سی موجودگی کی خوشبوئیں
خمارِ قرب کے خواب
ہزار غم کہ جنھیں کیف شوق کی نیندیں
پیامِ تسکیں دیں

(۳-۱۹۵۷)

کہانی ایک ملک کی

راج محل کے دروازے پر
آ کے رُکی اک کار
پہلے نکلا بھدا، بے ڈھب، بودا،
میل کچیل کا تودا
حقہ تھامے اک میراسی،
عمر اس کی کوئی اسی بیاسی
پیچھے اس کا نائب، تمبا کو بردار،
باہر رینگے اُس کے بعد قطار قطار
عنبر بار
نمبردار
ساتھ سب ان کے دم چھلے
ایم ایل اے

راج محل کے اندر اک اک رتنا سن پر
کوڑھی جسم اور نوری جامے
روگی ذہن اور گردوں پیچ عمامے
جہل بھرے علامے
ماجھے، گامے
بیٹھے ہیں اپنی مٹھی میں تھامے
ہم مظلوموں کی تقدیروں کے ہنگامے
جیبھ پہ شبد — اور جیب میں چاقو
نسل بلا کو!

راج محل کے باہر، سوچ میں ڈوبے شہر اور گاؤں
ہل کی انی، فولاد کے پنجے
گھومتے پہیے، کڑیل باہیں
کتنے لوگ کہ جن کی روحوں کو سندیسے بھیجیں
سکھ کی سیجیں،
لیکن جو ہر راحت کو ٹھکرائیں
آگ پئیں اور پھول کھلائیں

دیکھ اے دِل!

دیکھ اے دل، کیا سماں ہے، کیا بہاریں شام ہے،
وقت کی جھولی میں جتنے پھول ہیں، انمول ہیں
نہر کی پٹڑی کے دو رویہ، مسلسل دُور تک
برگدوں پر پنچھیوں کے غل مچاتے غول ہیں

دیکھ اے دل، کتنے ارمانوں کا رس برسا گئیں
بدلیاں، جب ان پہ چھینٹے نور کے چھن کر پڑے
کتنی کومل کامناؤں کی کہانی کہہ گئے
پیپلوں کے پیلے پیلے پات پتھ پتھ پر پڑے

دیکھ اے دل اس رسیلی رُت کے کتنے رُوپ ہیں
جُھومتے جھونکے ہیں، جھکتی جھاڑیوں کے جھنڈ ہیں
ہائے ان پھیلی ہوئی پھلواڑیوں کے درمیاں
یہ تری تپتی ہوئی تنہائیاں اور ایک میں

غزل

جھونکوں میں رس گھولے دل
پون چلے اور ڈولے دل

جیون کی رُت کے سَو روپ
نغمے ' پھول ' جھکولے ' دل

تاروں کی جب جوت جگے
اپنے خزانے کھولے دل

یادوں کی جب پینگ چڑھے
بول البیلے بولے دل

کس کی دھن ہے باورے من؟
تیرا کون ہے ؟ بھولے دل

غزل

وہ شے جو ایک نئے دور کی بشارت ہے
ترے لہو کی تڑپتی ہوئی حرارت ہے

نظامِ کہنہ کے سائے میں عافیت سے نہ بیٹھ
نظامِ کہنہ تو گرتی ہوئی عمارت ہے

وطن چمکتے ہوئے کنکروں کا نام نہیں
یہ تیرے جسم تری روح سے عبارت ہے

یہ کہہ رہی ہے صدا ٹوٹتے سلاسل کی
کہ زندگی تو فقط اک حسیں جسارت ہے

یہ اک جھلک ہے بدلتے ہوئے زمانوں کی'
جبیں جبیں پہ شکن بھی کوئی بجھارت ہے

چمن میں اہل چمن کے یہ طور' ارے توبہ
کلی کلی کی ہنسی. خندۂ حقارت ہے

دلوں کی جھونپڑیوں میں بھی روشنی اُترے
جو یوں نہیں تو یہ سب سیل نور اکارت ہے

غزل

دن کٹ رہے ہیں کشمکشِ روزگار میں
دم گھٹ رہا ہے سایۂ ابرِ بہار میں

آتی ہے اپنے جسم کے جلنے کی بو مجھے
لٹتے ہیں نکہتوں کے سبو جب بہار میں

گزرا اِدھر سے جب کوئی جھونکا تو چونک کر
دل نے کہا: 'یہ آ گئے ہم کس دیار میں'

اے کنجِ عافیت تجھے پا کر پتہ چلا
کیا ہمہمے تھے گردِ سرِ رہگزار میں

میں ایک پل کے رنجِ فراواں میں کھو گیا
مرجھا گئے زمانے مرے انتظار میں

غزل

اُمیدِ دیدِ دوست کی دُنیا بسا کے ہم
بیٹھے ہیں مہر و ماہ کی شمعیں بُجھا کے ہم

وہ راستے خبر نہیں کس سَمت کھو گئے
نکلے تھے جن پہ رخصتِ غمِ دل اُٹھا کے ہم

پلکوں سے جن کو جلتے زمانوں نے چُن لیا
وہ پھول، اس روش پہ، ترے نقشِ پا کے ہم

آئے کبھی تو پھر وہی صبحِ طرب کہ جب
روٹھے ہوئے غموں سے ملیں مسکرا کے ہم

کس کو خبر کہ ڈوبتے لمحوں سے کس طرح
اُبھرے ہیں یادِ یار، تری چوٹ کھا کے ہم

غزل

قریبِ دل، خروشِ صد جہاں ہم
جو تم سن لو، تمھاری داستاں ہم

کسی کو چاہنے کی چاہ میں گُم
جیے بن کر نگاہِ تشنگاں ہم

ہر اک ٹھوکر کی زد میں لاکھ منزل
ہمیں ڈھونڈو، نصیبِ گمرہاں ہم

ہمیں سمجھو، نگاہ ناز والو!
لبوں پر کانپتا حرفِ بیاں ہم

بجھی شمعوں کی اِس نگری میں، امجدؔ
اُبھرتے آفتابوں کی کماں ہم

آورد

دھیان کا جب بھی کوئی پٹ کھولا
''میری بات نہ کہہ......'' دل بولا
دل کی بات کہی بھی نہ جائے
ضبط کی مَیں سہی بھی نہ جائے
نظم میں کِس کا ذکر کروں اب
فکر میں ہُوں کیا فکر کروں اب
ایک عجب اُلجھن میں گھرا ہوں
کیا سوچوں' یہ سوچ رہا ہوں

میں نے بہت کم شاعر ایسے دیکھے ہیں جن کے یہاں زندگی کی ہولناک سنجیدگی اور مقدر کی ستم آرائی کے ایسے دردناک تصورات موجود ہوں اس کے باوجود اس کے قاری کا مجموعہ تاثر انبساط میں اتنا ڈوب کر باہر آتا اور مطمئن ہوتا ہو جتنا امجد کے کلام سے ہوتا ہے۔ امجد زندگی کو دس بھرا رس کہتا ہے مگر اس کے کلام میں رس رچا ہوا ہے کہ دس کی تاثیر منفی ہو جاتی ہے۔

(ڈاکٹر سید عبداللہ)

مجید امجد نے جس آفاقی شعور کا مظاہرہ کیا ہے وہ اقبال کے بعد مجید امجد ہی کی نظم میں پوری طرح اُجاگر ہوا ہے اس فرق کے ساتھ کہ اقبال کا رویہ فلسفیانہ ہے جبکہ مجید امجد نے سائنسی سوچ سے استفادہ کیا ہے

(ڈاکٹر وزیر آغا)

مجید امجد ہمارے دور کے بڑے شاعر بھی ہیں اور اہم بھی۔ بڑے شاعر غالب، انیس اور اقبال کے معنوں میں۔ اہم یوں کہ ان کے مطالعے کے بغیر ہمارے شاعرانہ ذوق اور فنی ارتقاع کی تربیت نامکمل رہے گی۔

(سید جعفر طاہر)

میراجی، فیض اور راشد نے اپنے مکاتب فکر کو جنم دیا ہے۔ اس عہد کے بیشتر لکھنے والے ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے پیچھے لمبی قطاروں میں کھڑے ہیں مگر مجید امجد نے نہ کسی کی تقلید کی ہے اور نہ کسی کو اپنی تقلید کی ترغیب دی ہے۔ مجید امجد ابھی تک بہت نیا ہے جبکہ میراجی، فیض، اور راشد پرانے ہو چکے ہیں۔

(شہزاد احمد)

نئی نظم اور آزاد نظم کے سلسلے میں کچھ سکہ بند نام بار بار دہرائے جاتے ہیں لیکن میرے نزدیک ان سب سے زیادہ اہم اور دور رس اثرات کا حامل کام مجید امجد نے کیا ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات، تکنیک، نظم کی فکری اور فنی ترتیب، نئے اسالیب کی طرف بے جھجک پیش قدمی اور سب سے بڑھ کر زندگی بھر ایک نئے لہجے کی تلاش کا عمل وہ بنیادیں ہیں جن پر مستقبل کی شاعری کو اپنے کاخ و کو بلند کرنے ہیں۔

(امجد اسلام امجد)